تقسیم ہند پر لکھے گیے منٹو کے افسانے

فہرست

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کردی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کربیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں۔ بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ گوسر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، مگر اس کے قدوقامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔ ''ایشر سیاں۔''

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی۔ ''ایشر سیاں۔'' لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''مجھے معلوم نہیں۔''

کلونت کور بھنا گئی۔ ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جواب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ '' جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ''کلونت!''

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آگئی۔ ''ہاں جانی'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟''

''بُرے کی ماں کے گھر۔'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔ ''قسم واہگورو کی بڑی جاندار عورت ہے۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا۔ ''تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے؟۔۔۔۔۔۔ شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی۔ ''نہیں تم ضرور شہر گئے تھے۔۔۔۔۔۔ اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔

''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔''

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہوگیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ ''دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔۔۔۔۔۔ ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟''

''تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں ہے۔''

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہوگیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟''

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنو مند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کردیا۔ ''جانی میں وہی ہوں۔۔۔۔۔۔ گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔۔۔۔۔۔''

کلونت کور نے مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ''تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟''

''برے کی ماں کا وہ ہوگیا تھا۔''

''بتاؤ گے نہیں؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''

''مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔''

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آگئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''آجاؤ، ایک بازی تاش کی ہو جائے!''

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا۔ ''چل دفان ہو۔''

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ''نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔''

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا۔ ''لو، پھر ہو جائے ترُپ چال۔۔۔۔۔۔''

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا، پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ ''کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔''

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی۔ ''بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں۔''
ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔ '' ہونے دے آج ظلم؟'' اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لووں کو کاٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، ابھرے ہوئے کولہوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کرسکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے۔ سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کردیے۔ پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر کہا۔ ''ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!''
یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا ''ایشر سیاں، وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے۔ جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟''
ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
کلونت کور غصے سے ابلنے لگی۔ ''میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے چڈو۔۔۔۔۔۔ کون ہے وہ الفتی۔۔۔۔۔۔ کون ہے وہ چورپتا؟''
ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں۔''
کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔۔۔۔۔۔ کھا واہگورو جی کی قسم۔۔۔۔۔۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''
ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ ''قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔۔۔۔۔۔ تکا بوٹی کردوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا۔۔۔۔۔۔ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم۔۔۔۔۔۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سرہلایا، کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کردیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہیں۔

ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی۔ ''جانے دے اب کلونت! جانے دے۔''

آواز میں بلا کا درد تھا، کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلِے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔ ''میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔۔۔۔۔۔ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔ ''مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟''

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''اور میں۔۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کرچکا ہوں۔۔۔۔۔۔ اسی کرپان سے۔۔۔۔۔۔''

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ ''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟''

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ ''گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔''

کلونت چلائی۔ ''میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟''

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔ ''بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔ ''انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔''

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔ ''ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر۔''

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔۔۔۔۔۔ ''مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ گلا چرا ہے ماں یا میرا۔۔۔۔۔۔ اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔''

اور جب وہ بات بنانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔

کلونت! میری جان۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔ انسان کڑی ما بھی ایک

عجیب چیز ہے۔۔۔۔۔۔ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔۔۔۔۔۔گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیے۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔''

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا۔جس مکان پر۔۔۔۔۔۔ میں نے دھاوا بولا تھا۔۔۔۔۔۔ اس میں سات ۔۔۔۔۔۔ اس میں سات آدمی تھے۔۔۔۔۔۔چھ میں نے۔۔۔۔۔۔ قتل کر دیے۔۔۔۔۔۔ اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے۔۔۔۔۔۔ چھوڑ اسے۔۔۔۔۔۔ سن۔۔۔۔۔۔ ایک لڑکی تھی،بہت سندر۔۔۔۔۔۔ اس کو اٹھا میں اپنے ساتھ لے آیا۔''

کلونت کور، خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا۔ ''کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی۔۔۔۔۔۔ میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا۔ ''نہیں، ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی بھی چکھ دیکھ۔''

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا۔ ''ہوں۔۔۔۔۔۔!''

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔۔۔۔۔۔ راستے میں۔۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہا تھا میں؟۔۔۔۔۔۔ہاں راستے میں۔۔۔۔۔۔ نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔۔۔۔۔۔ پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں ''۔۔۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔''میں نے۔۔۔۔۔۔ میں نے پتا پھینکا۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن۔''

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کےجسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ ''وہ۔۔۔۔۔۔ وہ مری ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ لاش تھی۔۔۔۔۔۔بالکل ٹھنڈا گوشت۔۔۔۔۔۔ جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔۔۔۔۔۔''

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کردیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہوگیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کردیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اسی لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا دیے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ مے گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔ ''مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔'' یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہوگیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔ ''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرایا۔ ''مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔۔۔۔۔۔ ہندوستانی بڑے شیطانی، اکڑ اکڑ پھرتے ہیں۔''

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرسکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کہاں ہے، اس کا محل وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔۔۔۔۔۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے!
اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!
ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔ ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔۔۔۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔''
بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔
ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجنیئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ، باغ کی ایک خاص روش پر، سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کردیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کردیا۔
چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کردی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کردیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کردیا گیا۔
لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہوگیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا، مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کردیے۔۔۔۔۔۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔
جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔
یورپین وارڈ میں اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کرکے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو

بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب وغریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ ''اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانادی منگ دی دال اف دی لالٹین۔'' دیکھتا تھا رات کو۔ پہرداروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تھا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ''اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں ''آف دی پاکستان گورنمنٹ'' کی جگہ ''اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ'' نے لی لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا، اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے، جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت

تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہوگیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوا کے پہنتا اور یوں سج کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار '' اوپر دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین '' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں، جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا '' وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔ ''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دیدے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا: ''اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورجی دا خالصہ اینڈ واہے گوروجی کی فتح۔۔۔۔۔۔ جو بولے

سوہاں، ست سری اکال۔

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمان کے خدا ہو۔۔۔۔۔۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔ ''یہ تم سے ملنے آیا ہے۔۔۔۔۔۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا'' میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔۔۔۔۔۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے۔۔۔۔۔۔ مجھ سے جتنی مدد ہوسکی، میں نے کی۔۔۔۔۔۔ تمہاری بیٹی روپ کور۔۔۔۔۔۔''

وہ کچھ کہتے کہتے روک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔ ''بیٹی روپ کورا''

فضل دین نے رک رک کر کہا''ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا'' انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔۔۔۔۔۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جارہے ہو۔۔۔۔۔۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا۔۔۔۔۔۔ اور بہن امرت کور سے بھی۔۔۔۔۔۔ بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔۔۔۔ دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں۔۔۔۔۔۔ اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔''

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کردی اور فضل دین سے پوچھا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''کہاں ہے۔۔۔۔۔۔ وہیں ہے جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پھر پوچھا۔ ''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں، پاکستان میں۔'' فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ ''اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف پاکستان اینڈ ہندوستان

آف دی در فٹے منہ۔''

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں، جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوئے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیوں کہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔۔۔۔۔۔پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر یہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔ ''پاکستان زندہ باد'' اور ''پاکستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرہ سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔۔۔۔۔۔پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

متعلقہ افسر ہنسا۔ ''پاکستان میں۔''

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔

پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔۔۔۔۔۔'' اور زور زور سے چلانے لگا۔ ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔۔۔۔۔۔اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں

بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔۔۔۔۔۔ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔۔۔۔۔۔ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا!

رام کھلاون

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔۔۔۔۔۔ میں نے اس تصویر سے اس کو پُر کردیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضعداری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہورہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جارہا ہے۔ دھوبی شریف آدمی تھا۔ یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میری کپڑے لے آتا تھا، لیکن پھر پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو میری نادہندگی سے تنگ آکر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کردے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا۔ ''ساب سلام۔'' کرکے اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کردیا۔ اور ایک عجیب اور غریب آواز حلق سے نکالی۔ ''ہے ہے ہے ہیں؟''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے دھوبی؟''

دھوبی کی نظریں اس تصویر پر جمی رہیں۔ ''یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟''

''کون؟''

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا۔ ''ساعید شالیم بالشٹر۔''

''تم جانتے ہو انھیں؟''

دھوبی نے زور سے سر ہلایا۔ ''ہاں۔۔۔۔۔۔ دو بھائی ہوتا۔۔۔۔۔۔ ادھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا۔۔۔۔۔۔ ساعید شالیم بالشٹر۔۔۔۔۔۔ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا۔''

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہوگی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک بمبے میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ''دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم۔''

دھوبی نے زور سے سرہلایا۔ ''ہاں۔۔۔۔۔۔ ساعیدشا لیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا۔۔۔۔۔۔ ایک دھوتی دیا۔۔۔ ایک کرتہ دیا۔۔۔نیا۔۔۔بہت اچھا لوگ ہوتا۔۔۔ ایک کا داڑھی ہوتا۔۔۔یہ بڑا۔'' اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا: ''یہ چھوٹا ہوتا۔۔۔۔۔۔ اس کا تین بلوا لوگ ہوتا۔۔۔ دو لڑکا، ایک لڑکی۔۔۔ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا۔۔۔ کولابے میں کوٹھی ہوتا۔۔۔بہت بڑا۔۔۔۔۔۔''

میں نے کہا۔ ''دھوبی یہ میرے بھائی ہیں۔''

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی۔ ''ہے ہے ہے ہیں؟۔۔۔ ساعیدشا لیم بالشٹر؟؟''

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔۔۔ داڑھی والے محمد حسن ہیں۔۔۔ ہم سب سے بڑے۔''

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا۔۔۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی بجلی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھا۔ ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزارہا کھٹمل تھے۔ دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعیدشا لیم بالشٹر کا بھائی ہوں۔ لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا۔ ''ساعیدشا لیم بالشٹر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں!''

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔۔۔۔۔۔ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔۔۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

''ہاں ساب۔۔۔۔۔۔ تم بروبر کہتا ہے۔'' یہ کہہ کر دھوبی نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک آنے جانے کے لیے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لیے میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا۔ ''دھوبی۔۔۔۔۔۔ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔۔۔۔۔۔ خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔''

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا۔ ''ساب ہم حساب نہیں رکھتے۔۔۔۔۔۔ ساعیدشا لیم بالشٹر کا ایک برس کام کیا۔۔۔۔۔۔ جو دے دیا، لے لیا۔۔۔۔۔۔ ہم حساب جانتے ہی ناہیں۔''

یہ کہہ وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی۔۔۔۔۔۔ میری شادی ہوگئی۔ حالات بھی بہتر ہوگئے اور میں سکینڈپیر خان اسٹریٹ کی

دھوبی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا۔ ''بیگم ساب۔۔۔۔۔۔ ساب کا بھائی ساعید شا لیم بالشٹر بہت بڑا آدمی ہوتا۔۔۔۔۔۔ ادھر کولابہ میں رہتا ہوتا۔۔۔۔۔۔ جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ تمہارا ساب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوا۔''

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا۔۔۔۔۔۔ جب دے دیا، جو دے دیا۔ اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔۔۔۔۔۔ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''چار برس میرا کام کرتا رہا۔۔۔۔۔۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔''

جواب یہ ملا۔ ''حساب کیوں کرتا۔۔۔۔۔۔ ویسے دوگنے چوگنے وصول کرلیتا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ نہیں جانتے۔۔۔ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں۔''

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا۔ ''بیگم ساب۔۔۔۔۔۔ ہم حساب جانت ناہیں۔ تم جھوٹ ناہیں بولتے گا۔۔۔۔۔۔ ساعید شا لیم بالشٹر جو تمہارے ساب کا بھائی ہوتا۔۔۔۔۔۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ بیگم ساب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔۔۔۔۔۔ ہم بولتا، ٹھیک ہے!''

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے کے لیے اس سے کہا۔ ''دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے۔''

اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ بیگم ساب، تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔''

میری بوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ سال وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آگیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کیے کیونکہ بے حد لیمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانی دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جب کہ ہم بالکل

بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آگیا اور کہنے لگا۔ ساب کو ہم نے تک دن بس میں دیکھا۔۔۔ ہم بولا، ایسا کیسا۔۔۔۔۔۔ ساب تو دلی چلا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ ہم نے ادھر بائی کھلہ میں تپاس کیا۔ چھاپہ والا بولا، اُدھر ماہم میں تپاس کرو۔۔۔۔۔۔ باجو والی چالی میں ساب کا دوست ہوتا۔۔۔۔۔۔ اس سے پوچھا اور آگیا۔"

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگرس برسر اقتدار آئی تو امتناعِ شراب کا حکم نافذ ہوگیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہوگئی۔ ننانوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔۔۔ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔۔۔۔۔۔ ہمارا دھوبی بیمار ہوگیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کرکے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہوگئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کردیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب،، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کرسکتے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "تو آدھا آدھا کرلیجیے۔"

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کرلی۔

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہوگئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہوگئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا۔ بھگوان ساب کو ساعید شالیم بالشٹر بنائے۔۔۔۔۔۔ ادھر کولابے میں ساب رہنے کو جائے۔۔۔۔۔۔ باوا لوگ ہیں۔۔۔ بہت بہت پیسہ ہو۔۔۔ بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا۔۔۔ موٹر میں۔۔۔ ادھر کِلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔۔۔۔۔۔ بھگوان بیگم ساب کو خُس رکھے۔۔۔۔۔۔"

کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔ دھوبی بلاناغہ اتوار کو آتا رہا۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ دعائیں دیتا تھا۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا۔ پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن

دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کیے جانے لگے۔ میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوبی سے کہا۔ '' دیکھو دھوبی اب تم کام بند کردو۔۔۔۔۔۔ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے۔''

دھوبی مسکرایا۔ '' ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا۔''

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا۔

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحات پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔۔۔۔۔۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آگیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کردی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں شروع کردیں۔ ساعیدشا لیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔۔۔۔۔۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا۔۔۔۔۔۔ باہر گام گیا ہے نا؟۔۔۔۔۔۔ اپنے ملک میں؟۔۔۔۔۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا سلام بولو۔۔۔۔۔۔ موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں۔۔۔۔۔۔ ہم کو اتنا جلاب آنا ہوتا۔۔۔ ڈاکٹر نے سوئی لگایا۔۔۔۔۔۔ ایک دم ٹھیک ہوگیا۔۔۔۔۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا سلام بولو۔۔۔۔۔۔ بولو رام کھلاون بولتا ہے، ہم کو بھی کاگج لکھو۔۔۔۔۔۔''

میں نے اس کی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا۔ ''دھوبی۔۔۔۔۔۔ دارو شروع کردی؟''

دھوبی ہنسا '' دارو؟۔۔۔۔۔۔ دارو کہاں سے ملتی ہے ساب؟''

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور سلام کرکے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہوگئے۔ لاہور سے تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کرلیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہا لکشمی روانہ ہوگیا۔

کرفیو کے وقت میں بھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس لیے آمدورفت جاری تھی۔ ٹریمیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پل

کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا، دو بھینسوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کردیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔۔۔۔۔۔ جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا۔ ''رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟''

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا۔ ''کیا پوچھت ہے؟''

''پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟''

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا۔ ''تم کون ہے؟''

''میں؟۔۔۔۔۔۔ رام کھلاون میرا دھوبی ہے۔''

''رام کھلاون تہار دھوبی ہے۔۔۔۔۔۔ تو کس دھوبی کا بچہ ہے۔''

ایک چلایا۔ ''ہندو دھوبی یا مسلمین دھوبی کا۔''

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو؟۔۔۔۔۔۔ میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا۔ جس کو مدد کیلیے پکارتا۔۔۔۔۔۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کردی۔ رام کھلاون ہندو ہے۔۔۔۔۔۔ ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی کھولی کہاں ہے۔۔۔۔۔۔ دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے۔۔۔۔۔۔ بہت بیمار تھا۔۔۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا۔۔۔ ہماری بیگم۔۔۔۔۔۔ ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی۔۔۔۔۔۔ یہاں تک میں نے کہا کہ تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لیے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کردی چنانچہ میں نے ان سے کہا ''میں مسلمین ہوں۔''

''مار ڈالو۔۔۔۔۔۔۔ مار ڈالو'' کا شور بلند ہوا۔

دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا۔ ''ٹھہرو۔۔۔۔۔۔ اسے رام کھلاون مارے

گا۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کردیں۔ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔'' رام کھلاون۔''

رام کھلاون دہاڑا۔''چپ کر بے رام کھلاون کے۔۔۔۔۔۔''

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آپہنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا۔''مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟''

رام کھلاون نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔۔۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا۔'' ساب!'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا''یہ مسلمین نہیں۔۔۔ساب ہے۔۔۔۔۔۔بیگم ساب کا ساب۔۔۔۔۔۔ وہ موٹر لے کر آیا تھا۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔۔۔ نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا۔''

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔۔۔۔۔۔ سب شرابی تھے۔تُوتُو میں میں شرع ہوگئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہوگئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا سامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بے قرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آجائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہوگئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کرلے گا۔

دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آ گئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

''ساب سلام!''

''سلام''

''میں اندر آجاؤں؟''

''آؤ''

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے نکال پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں

[illegible]

اور گلو گیر آواز میں کہا۔ ''آپ جا رہے ہیں ساب؟''

''ہاں''

اس نے رونا شروع کردیا۔ ساب، مجھے ماف کردو۔۔۔۔۔۔۔یہ سب دارو کا قصور تھا۔۔۔۔۔۔ اور دارو۔۔۔۔۔۔ دارو آج کل مفت ملتی ہے۔۔۔۔۔۔ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔۔۔۔۔۔ مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب۔۔۔۔۔۔ ہم کو ماف کردو۔۔۔ ہم پئے لا تھا۔۔۔۔۔۔ ساعید شا لیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔۔۔ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔۔۔ جلاب سے ہم مرتا ہوتا۔۔۔ وہ موٹر لے کر آتا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسہ خرچ کرتا۔۔۔ ملک ملک جاتا۔۔۔ بیگم صاب سے مت بولنا۔ رام کھلاون۔۔۔۔۔۔''

اس کی آواز گلے میں رُندھ گئی۔ گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا ''ٹھہرو رام کھلاون۔'' لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

ننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا۔ صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں ''بھانڈے قلعی کرالو'' کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما سے جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو، بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابھی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ ننگی بچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھر والی۔ گاما نے اس کان سنا۔ اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی۔ اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلّن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے اردگرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہوگیا۔ کلّن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کردیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہوگیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا نہ بھائی۔ میں اپنے نردئے پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا۔'' لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر

سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن ہی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''میری شادی کردو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔''
گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا۔ ''یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں۔''
بھولو بہت سنجیدہ ہوگیا۔ ''تمہیں نہیں معلوم۔۔۔۔۔۔پندرہ راتیں ہوگئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔''
گاما نے پوچھا۔ ''کیوں کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں یار۔۔۔۔۔۔ دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہورہا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک!''
گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔ ''وہ جو کلن ہے، اس نے تو حد ہی کردی ہے۔۔۔۔۔۔ سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی۔۔۔۔۔۔ بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ۔۔۔۔۔۔''

گاما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی۔ اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا۔ ''ہاں بھئی، کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے۔'' کوئی کہتا۔ ''میاں مفت میں مزے لیتے ہو۔۔۔۔۔۔ ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو۔۔۔۔۔۔ سو فیصدی گالی بولتی۔''
بعض نے گندے گندے مذاق کیے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا۔ ''تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا یہ جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہوگئے ہیں جاگتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ تم میری شادی کا بندوبست کردو، ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔ بھابھی کے پاس میرا پانسو روپیہ جمع ہے۔۔۔۔۔۔ جلدی کردو بندوبست!''
گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا۔ ''اچھا ہو جائے گا بندوبست۔ تمہاری بھابھی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔''
ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہوگئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھی۔ تندرست تھا۔ جون کے وسطے میں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا مگر

بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کر کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ یہ کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کردیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تربتر ہوگیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟۔۔۔۔۔۔ کیا آپ پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے، پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں، سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کردیتی ہے۔ وہ سامنے کلّن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عبدو حلوائی کی کنواری بیٹی شاماں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کرلیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

''اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔ مجھے بھی''۔۔۔۔۔۔ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہوگئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارکبادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست

تھے، انھوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابھی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے، گھونگٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتا اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا۔ مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دولھن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دولہن سمیت داخل ہو جائیگا اور صبح منہ ادھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموش تھی۔ دولہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے، کھانسنے، کھنکارنے کی آوازیں اِدھر اُدھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کُھسر پُھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی۔ وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی۔ ''یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی۔۔۔۔۔۔ عیدو حلوائی کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے۔ اور ساری چارپائیں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔ بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں۔۔۔۔۔۔ آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے لڈو پھوٹے تھے۔ بڑا بھولا تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا
آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں۔۔۔۔۔۔ وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کردیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی۔۔۔۔۔۔ بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں۔ کلّن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کے ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی۔ پھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے آواز دی، ''کیوں استاد بھولو، کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے۔''

چھاگے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔''

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا۔ ''کیوں پہلوان، کیسا رہا دنگل؟''

بھولو تو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموش رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر وہی چرچوں چرچوں، وہی کھانسنا کھنکارنا۔۔۔ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے۔۔۔۔۔۔ کروٹوں پر کروٹیں، دبی دبی ہنسی۔۔۔ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دولہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا، مجھے کیا ہوگیا ہے۔۔۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔''

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آکر بھولو نے اپنی دولہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گاما نے

بھولو سے کہا۔ ''یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو۔''

بھولو نے صرف اتنا کہا۔ ''ٹھیک ہے؟''

گاما نے پوچھا۔ ''ٹھیک کیا ہے۔۔۔۔۔۔ جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟''

بھولو بات گول کر گیا تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابھی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی۔ ''تم جو کہتے ہو نا کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں، یہ غلط ہے۔''

گاما کی آواز آئی ''تو اور کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔ بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔''

''دلچسپی کیا ہو۔''

''کیوں؟''

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا۔ ''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہا۔''

گاما کی بیوی بولی۔ ''عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا۔۔۔۔۔۔ بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔''

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا۔ ''یہ تو بہت بُرا ہوا!''

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ گئے تھے اکھیڑنے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس، اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اور وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

سو کینڈل پاور کا بلب

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں ٹانگے کھڑے رہتے ہیں۔ بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

یہی پارک جو صرف دو برس پہلے اتنی پُررونق جگہ تھی اب اجڑی پجڑی دکھائی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہاں اب بے حد میلے کچیلے کپڑوں میں لوگ ادھر ادھر بیم قصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپنا روپ کھو چکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے بیوہ عورتیں۔

وہ حیران تھا کہ وہ غازہ کہاں گیا۔ وہ سیندور کہاں اڑگیا۔ وہ سر کہاں غائب ہوگئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سنے تھے۔۔۔۔۔۔زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہو تو(دو برس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے)یہاں آیا تھا۔ کلکتے سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلایا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی کہ اسے کرائے پر ایک کمرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔

مگر اب اس نے دیکھا کہ جس کنجڑے، جولاہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی۔ فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جما رہا تھا۔

جہاں کسی شان دار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہاں چولہے سلگ رہے ہیں۔ جہاں کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ وہاں دھوبی میلے کپڑے دھو رہے ہیں۔

دو برس میں اتنا بڑا انقلاب!

وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا۔ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے۔ اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب و غریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ و روپ بھی چوس کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کیے۔ عورتوں کی بے عزتی کی۔ لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی یہی سلوک کیا۔

اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا۔ سب ننگا اور جوبن بریدہ تھا۔

وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کررہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا

چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں تانگے کھڑے رہا کرتے ہیں میرا انتظار کرنا۔ دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تو یہ ٹانگوں کا اڈا بہت مشہور جگہ تھی، سب سے عمدہ، سب سے بانکے ٹانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا۔ بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔

شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں دستیاب ہوتے تھے۔ اس لیے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔

اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے عیش کیے تھے۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہر رات کو ان کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اسکاچ جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔

ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر ان پروہ کلغیاں، وہ پھندنے، وہ پیتل کے پالش کیے ہوئے سازو سامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اڑ گئی تھی۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ فروری کے دن تھے۔ شام کے سائے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہوٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کو ہولے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آگیا۔ مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل و صورت کا، لٹھے کی نئی شلوار میں جس میں اب اور زیادہ شکنوں کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پاپلین کی قمیض جو لانڈری میں جانے کے لیے بیتاب تھی۔

اس نے پوچھا

''کیوں بھئی۔ تم نے مجھے بلایا؟''

اس نے ہولے سے جواب دیا۔

''جی ہاں۔''

اس نے خیال کہ مہاجر ہے بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ ''کیا مانگتے ہو؟''

اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''جی کچھ نہیں۔'' پھر قریب آکر کہا۔ ''کچھ چاہیے آپ کو؟''

''کیا؟''

ہوئی بڑی وری۔ یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے سینے میں ایک تیر سا لگا کہ دیکھو اس زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹٹولتا پھرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر انسانیت کے متعلق اوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیر اثر اس نے پوچھا۔

''کہاں ہے؟''

اس کا لہجہ دلال کے لیے امید افزا نہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔''

اس نے اس کو روکا۔ ''یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ وہ سولی پر بھی۔۔۔۔۔۔ جلتی چتا میں بھی۔۔۔۔۔۔''

وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ ''دیکھو۔۔۔۔۔۔ اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔''

دلال قریب آگیا۔ ''پاس ہی۔۔۔۔۔۔بالکل پاس۔''

''کہاں؟''

''یہ سامنے والی بلڈنگ میں۔''

اس نے سامنے والی بلڈنگ کو دیکھا۔

''اس میں۔۔۔۔۔۔ اس بڑی بلڈنگ میں؟''

''جی ہاں۔''

وہ لرز گیا۔ ''اچھا۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔؟''

سنبھل کر اس نے پوچھا۔ ''میں بھی چلوں؟''

''چلیے۔۔۔۔۔۔ لیکن میں آگے آگے چلتا ہوں۔'' اور دلال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چلنا شروع کردیا۔

وہ سینکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہولیا۔

چند گزوں کا فاصلہ تھا۔ فوراً طے ہوگیا۔ دلال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے۔ جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی حالت سب سے خستہ تھی، جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔

اب شام گہری ہوگئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو اندھیرا شروع ہوگیا۔ چوڑا چکلا صحن طے کرکے وہ ایک صرف مڑا۔ عمارت بنتے بنتے رک گئی تھی۔ ننگی اینٹیں تھیں۔ چونہ اور سیمنٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جا بجا بجری بکھری ہوئی تھی۔

دلال نامکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑ کر اس نے کہا۔

''آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں اب آیا۔''

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہوگیا۔ اس نے منہ اوپر کرکے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔

دو منٹ گزر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔

''اٹھتی ہے کہ نہیں؟''

کوئی عورت بولی۔ ''کہہ جو دیا مجھے سونے دو۔'' اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

دلال پھر کڑکا۔ ''میں کہتا ہوں اٹھ ۔۔۔۔۔۔ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ ۔۔۔۔۔۔''

عورت کی آواز ئی۔ ''تو مجھے مار ڈال ۔۔۔۔۔۔ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کر۔''

دلال نے پچکارا۔ ''اٹھ میری جان۔ ضد نہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا۔''

عورت بولی۔ ''گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔''

دلال کی آواز کڑی ہوگئی۔ ''تو نہیں اٹھے گی۔ حرامزادی، سور کی بچی ۔۔۔۔۔۔''

عورت چلانے لگی۔ ''میں نہیں اٹھوں گی ۔۔۔۔۔۔ نہیں اٹھوں گی ۔۔۔۔۔۔ نہیں اٹھوں گی۔''

دلال کی آواز بھنچ گئی۔

''آہستہ بول ۔۔۔۔۔۔ کوئی سن لے گا ۔۔۔۔۔۔ لے چل اٹھ ۔۔۔۔۔۔ تیس چالیس روپے مل جائیں گے۔''

عورت کی آواز میں التجا تھی دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں ۔۔۔۔۔۔ میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔ رحم کر ۔۔۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کر ۔۔۔۔۔۔''

''بس ایک دو گھنٹے کے لیے ۔۔۔۔۔۔ پھر سو جانا ۔۔۔۔۔۔ نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی''

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں بڑی تیز روشنی آرہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے۔۔۔۔۔۔ کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا۔ ''لے اب اٹھ۔۔۔۔۔۔ قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آجائے گی۔۔۔۔۔۔ پھر سو جانا۔''

وہ عورت ایک دم یوں اٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی چھچھوندر اٹھتی ہے اور چلائی۔ ''اچھا اٹھتی ہوں۔''

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر گیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے۔۔۔۔۔۔ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔ اس دنیا سے بھاگ جائے۔۔۔۔۔۔ مگر کہاں؟''

پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پر اتنا ظلم ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اور یہ دلال کون ہے؟۔۔۔۔۔۔ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بلب جلا کر جو سو کینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟

اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اتنا بڑا بلب؟۔۔۔۔۔۔ کیا وہ چھوٹا نہیں لگا سکتے۔ یہی پندرہ پچیس کینڈل پاور کا؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دو سائے اس کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک نے جو دلال کا تھا۔ اس سے کہا۔

''دیکھ لیجیے۔''

اس نے کہا۔ ''دیکھ لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے نا؟''

ٹھیک ہے۔''

''چالیس روپے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''دے دیجیے۔''

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلال کے حوالے کر دیے

روپے۔

''دیکھ لو کتنے ہیں!''

نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔

دلال نے کہا۔ ''پچاس ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''پچاس ہی رکھو۔''

''صاحب سلام۔''

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کو دے مارے۔

دلال بولا۔ ''تو لے جائیے اسے۔ لیکن دیکھیے تنگ نہ کیجیے گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جائیے گا۔''

''بہتر۔''

اس نے بڑی بڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پر وہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔

باہر ٹانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور عورت پیچھے۔

دلال نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

ٹانگہ چل پڑا۔۔۔۔۔۔ وہ اسے پاس ہی ایک ویران سے ہوٹل میں لے گیا۔۔۔۔۔۔ دماغ کو حتی المقدور اس تکدر سے جو اسے پہنچ چکا تھا نکال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر تک اجاڑ تھی۔۔۔۔۔۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھی سارے کا سارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گر جائے گی۔

وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''ذرا گردن تو اونچی کیجیے۔''

وہ زور سے چونکی۔ ''کیا؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو کیجیے۔''

اس کی آنکھیں سرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں۔۔۔۔۔۔ وہ خاموش رہی۔

''آپ کا نام؟''

''کچھ بھی نہیں؟'' اس کے لہجے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

''آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

''جہاں کی بھی تم سمجھ لو۔''

''آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں۔''

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لال بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کہاں؟''

عورت نے بڑی روکھی بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''جہاں سے مجھے تم لائے ہو۔''

''آپ چلی جائیے۔''

''تم اپنا کام کرونا۔۔۔۔۔۔مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟''

اس نے اپنے لہجے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں تنگ نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

وہ جھلاّ گئی۔ ''مجھے نہیں چاہیے کوئی ہمدرد۔'' پھر قریب قریب چیخ پڑی۔ ''تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو۔''

اس نے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔

''میں کہتی ہوں۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ جب سے آئی ہوں۔ جاگ رہی ہوں۔''

وہ سر تا پا ہمدردی بن گیا۔

''سو جاؤ یہیں۔''

عورت کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ تیز لہجے میں بولی۔ ''میں یہاں سونے نہیں آئی۔۔۔۔۔۔یہ میرا گھر نہیں۔''

''تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟''

عورت اور زیادہ خشمناک ہوگئی۔

''اف۔۔۔۔۔۔بکواس بند کرو۔۔۔۔۔۔ میرا کوئی گھر نہیں۔۔۔۔۔۔ تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس۔۔۔۔۔۔اس۔۔۔۔۔۔'' وہ گالی دیتی دیتی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتانا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

اور وہ اسے اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا:

''کیا جوان تھی؟''

اس نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا۔۔۔ میرے دماغ میں تو وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھر اٹھا کر دلال کا سر کیوں نہ کچل دیا۔''

دوست نے کہا۔ ''واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا۔''

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہوگئے۔

اس کا دوست چپکے سے ٹانگوں کے اڈے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلال کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھ بج چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہوگیا۔ لوگ اندر آجارہے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندھیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آرہی تھی۔ مگر کوئی آواز، کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کرکے وہ آگے بڑھا۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا۔ جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تاکہ تھوڑی دیر اندھیرے کی طرف منہ کرکے اپنی آنکھوں سے چکاچوند نکال سکے۔

اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر جھانکا۔۔۔۔۔۔ فرش کا جو حصہ اسے نظر آیا۔ اس پر ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔۔۔۔۔۔ سو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ منہ پر دوپٹہ تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا۔۔۔۔۔۔ اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبالی۔۔۔۔۔۔ اس عورت سے کچھ دور ننگے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا۔ جس کا سر پاش پاش تھا۔۔۔۔۔۔پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک نظر دیکھا۔۔۔۔۔۔ اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔۔۔۔۔۔ پاؤں پھسلا اور نیچے۔۔۔۔۔۔ مگر

اس نے چوٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

خدا کی قسم

ادھر سے مسلمان اور ادھر سے ہندو ابھی تک آجا رہے تھے۔ کیمپوں کے کیمپ بھرے پڑے تھے۔ جن میں ضرب المثل کے مطابق تل دھرنے کے لیے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ غلہ ناکافی ہے۔ حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں۔بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس کا ہوش کس کو تھا۔ ایک افراط و تفریط کا عالم تھا۔

سن اڑتالیس کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف رضا کاروں کے ذریعے سے ''مغویہ'' عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی تھیں ۔ میں جب ان کو سرگرم عمل دیکھتا تو مجھے بڑی تعجب خیز مسرت حاصل ہوتی،یعنی خود انسان انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔جو عصمتیں لٹ چکی تھیں۔ ان کو مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا۔ کس لیے؟۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلودہ نہ ہو؟۔ اس لیے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر روٹی کھائے؟۔ اس لیے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگا لے کر جب تک دوسرے آنکھیں بند کیے ہیں، عصمتوں کے چاک رفو کردے؟۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن ان رضا کاروں کی جدوجہد پھر بھی قابل قدر معلوم ہوتی تھی۔

ان کو سینکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں کھیکڑے تھے جو انھیں اٹھانے پڑتے تھے کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں، سیماب پا تھے، آج اِدھر، کل اُدھر، ابھی اس محلے میں، ابھی اُس محلے میں اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔

عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں۔۔۔۔۔۔ ایک لیا ژاں افسر نے مجھے بتایا کہ سہارن پور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کردیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے، اور کسی دور دراز سفر پر جارہی ہے۔۔۔۔۔۔ کئی لڑکیوں نے راستہ میں والدین کے خوف سے خود کشی کرلی، بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پاگل ہوچکی تھیں، کچھ ایسی بھی تھیں جن کو شراب کی لت پڑچکی تھی، ان کو پیاس لگتی تو پانی کی بجائے شراب مانگتیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں۔

میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ

ابھرتے۔۔۔۔۔۔ ان پیٹوں کا کیا ہوگا؟ ان میں جو کچھ بھرا ہے اس کا مالک کون ہے؟ پاکستان یا ہندوستان؟
اور وہ نو مہینوں کی بار برداری۔۔۔۔۔۔ اس کی اُجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان؟ کیا یہ سب ظالم فطرت یہ بہی کھاتے میں درج ہوگا؟۔۔۔۔۔۔ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے؟

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں، برآمدہ عورتیں جارہی تھیں۔

میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مغویہ کیوں کہلائی جاتی تھیں؟۔۔۔۔۔۔ انھیں اغوا کب کیا گیا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں، لیکن یہ اغوا کیسا ہے کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھری میں قید کرلیا۔

لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بیکار چیزیں تھیں۔۔۔۔۔۔ ان دنوں جس طرح گرمیوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کرتے سوتے تھے اسی طرح میں نے بھی، اپنے دل و دماغ کی بھی سب کھڑکیاں دروازے بند کردیے تھے، حالانکہ انھیں کھُلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی۔ لیکن میں کیا کرتا۔ مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں، برآمدہ عورتیں جارہی تھیں۔

یہ درآمد اور برآمد جاری تھی۔۔۔۔۔۔ تمام تاجرانہ خصوصیات کے ساتھ!

صحافی، افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے۔۔۔۔۔۔ لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آرہا تھا۔ قلموں کے قدم اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ اتنے صید تھے کہ سب بوکھلا گئے تھے۔

ایک لیاژاں افسر مجھ سے ملا، کہنے لگا۔ ''تم کیوں گُم سُم رہتے ہو؟

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے مجھے ایک داستان سنائی۔

مغویہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک شہر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ پھر تیسرے گاؤں، پھر چوتھے۔ گلی گلی، محلے محلے۔۔۔۔۔۔ کوچے کوچے۔۔۔۔۔۔ بڑی مشکلوں سے گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔

میں نے دل میں کہا۔ ''کیسے گوہر۔۔۔۔۔۔ کیسے زاسفتہ۔۔۔۔۔۔ یا سفتہ؟

تمہیں معلوم نہیں، ہمیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں تمہیں ایک بات بتلانے والا تھا۔۔۔۔۔۔ ہم بارڈر کے اس پار سینکڑوں پھیرے کرچکے ہیں عجیب بات ہے کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھا۔۔۔۔۔۔ اُدھیڑ عمر کی تھی۔۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے جالندھر کی بستیوں میں دیکھا، پریشان حال۔۔۔ ماؤف دماغ،

ویران ویران آنکھیں۔ گردو غبار سے اٹے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے، اسے تن کا ہوش تھا نہ من کا۔ لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

مجھے۔۔۔۔۔۔بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمہ کے باعث پاگل ہو گئی ہے۔ پٹیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو اسے نہیں ملتی، ہم نے بہت جتن کیے ہیں اسے ڈھونڈنے کے لیے ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلوؤں میں ماری گئی ہے لیکن یہ بڑھیا نہیں مانتی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اڈے پر دیکھا، اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر موٹی موٹی پیپڑیاں جمی تھیں، بال سادھوں کے سے بنے تھے۔ میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے۔ چنانچہ میں نے اس سے بہت سنگ دل بن کر کہا۔ ''مائی تیری لڑکی قتل کردی گئی تھی۔''

پگلی نے میری طرف دیکھا۔ ''قتل؟۔۔۔۔۔۔نہیں نہیں۔''

اس کے بعد لہجے میں فولادی تیقن پیدا ہو گئی۔ ''اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔''

اور وہ چلی گئی، اپنی موہوم تلاش میں۔۔۔۔۔۔

میں نے سوچا ایک تلاش اور پھر موہوم!۔۔۔۔۔۔لیکن پگلی کو کیوں اتنا یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی۔ کوئی تیز دھار یا چُھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ کیا وہ امر تھی یا اس کی مامتا امر تھی۔۔۔۔۔۔ مامتا تو خیر امر ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔۔۔۔کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا۔۔۔۔۔۔؟

تیسرے پھیرے پر پھر میں نے اسے دیکھا۔ اب وہ بالکل چیتھڑوں میں تھی، قریب قریب ننگی، میں نے اسے کپڑے دیے۔ لیکن اس نے قبول نہ کیے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مائی میں سچ کہتا ہوں، تیری لڑکی پٹیالہ ہی میں قتل کردی گئی تھی۔''

اس نے پھر اسی فولادی تیقن کے ساتھ کہا۔ ''تو جھوٹ کہتا ہے۔''

میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر۔ ''نہیں میں سچ کہتا ہوں، کافی روپیٹ لیا ہے تم نے۔۔۔۔۔۔چلو میرے ساتھ میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔''

اس نے میری بات نہ سنی اور بڑبڑانے لگی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے وہ ایک دم چونکی، اب اس کے لہجے میں تیقن فولاد سے

بھی زیادہ ٹھوس تھا۔۔۔۔۔۔ ''نہیں میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا!''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

بڑھیا نے ہولے ہولے کہا۔ ''وہ خوبصورت ہے۔۔۔۔۔۔ اتنی خوبصورت کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ اسے طمانچہ تک نہیں مار سکتا۔''

میں سوچنے لگ ''کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی۔۔۔۔۔۔؟ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی در حقیقت خوبصورت ہو۔۔۔۔۔۔ مگر اس طوفان میں کون سی خوبصورتی ہے جو انسان کے کُھر درے ہاتھوں سے بچی ہے۔۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے پگلی اس خیال خام کو دھوکا دے رہی ہے۔۔۔۔۔۔ فرار کے لاکھوں راستے ہیں۔۔۔۔۔۔ دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے گرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بُن دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔''

بارڈر کے اس پار کئی پھیرے ہوئے۔۔۔۔۔۔ ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا۔ اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ بینائی کمزور ہو چکی تھی، ٹٹول کر چلتی تھی، مگر اس کی تلاش جاری تھی بڑی شدومد سے۔ اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے، اس لیے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔

۔۔۔۔۔۔ بہن نے مجھ سے کہا کہ ''اس عورت سے مغز ماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل چکا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانہ میں داخل کرادو۔''

میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی، میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے، جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کرکے، اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی، اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔

آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کرادوں گا۔

وہ فرید کے چوک میں کھڑی اپنی نیم اندھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ چوک میں کافی چہل پہل تھی۔۔۔۔۔۔ میں بہن کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ایک مغویہ لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا، جس کے متعلق ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صبونیاں میں ایک ہندو بنیے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ سچ کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لیے آمادہ کروں کہ ایک جوڑا ادھر سے گزرا۔۔۔۔۔۔ عورت

سے گھونگٹ کاڑھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ چھوٹا سا گھونگٹ۔ اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان تھا۔ بڑا [illegible] چھیلا، بڑا تندرست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا۔۔۔۔۔۔

جب یہ دونوں اس پگلی کے پاس سے گزرے تو نوجوان ایک دم ٹھٹک گیا۔۔۔۔۔۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا، کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونگٹ اٹھایا لٹھے کی دھلی ہوئی چادر پہ چوکھٹے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

میں ان کے بالکل پاس تھا، سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہاری ماں!''

لڑکی نے ایک لحظے کے لیے پگلی کی طرف دیکھا اور گھونگٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھینچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چلو!''

اور وہ دونوں سڑک سے ادھر ذرا ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے۔۔۔۔۔۔ پگلی چلائی۔ ''بھاگ بھری۔۔۔۔۔۔ بھاگ بھری۔''

وہ سخت مضطرب تھی۔۔۔۔۔۔ میں نے پاس جا کر پوچھا ''کیا بات ہے مائی؟''

وہ کانپ رہی تھی۔ ''میں نے اس کو دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کو دیکھا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسے؟''

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھیلے متحرک تھے۔۔۔۔۔۔ ''اپنی بیٹی کو۔۔۔۔۔۔ بھاگ بھری کو!''۔۔۔۔۔۔

میں نے پھر سے کہا۔ ''وہ مر کھپ چکی ہے مائی''

اس نے چیخ کر کہا۔ ''تم جھوٹ کہتے ہو۔!''

میں نے اسم مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا۔ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، وہ مر چکی ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک میں ڈھیر ہو گئی۔

وہ لڑکی

سوا چار بج چکے تھے لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو دوپہر کو بارہ بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکنی میں آکر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اتنا سانولا کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قربت چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ کرسکتا تھا۔

موسم بہت واہیات قسم کا تھا۔ سوا چار بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کررہا تھا۔ لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چھوٹا جارہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے اتنا پانی نکل رہا تھا۔

سریندر نے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہوگا مگر پسینہ بلامبالغہ چار گلاس نکلا ہوگا۔ آخر یہ کہاں سے آیا!

جب اس نے لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے جسے دھوپ کی پرواہ ہے نہ موسم کی۔

سریندر پسینے میں لت پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بہت بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کررہا تھا جیسے اس کے بدن پر کسی نے موبل آئل مل دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ گھل مل جائے، اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔

آسمان خاکستری تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل ہیں یا محض گردوغبار۔ بہر حال، اس گردوغبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی سستا رہی تھی۔

سریندر نے اب کی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا مگر نقش بہت تیکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چبھے۔

مزدورپیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو۔ لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا۔ اصل میں وہ یہ فیصلہ کررہا تھا کہ آیا اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔

ھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بہن مری میں تھی۔ ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ایک بھائی، اس سے چھوٹا، وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔ سریندر کی عمر ستائس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس سے قبل وہ اپنی دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑا چکا تھا۔

معلوم نہیں کیوں، لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں یہ خواہش ہو رہی تھی کہ وہ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے یا اسے اوپر ہی سے اشارہ کرے تاکہ وہ اس کے پاس آجائے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطہ لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔

سریندر نے بالکنی کے کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھنکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔ سریندر نے جب کئی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی۔ ''ارے بھئی۔۔۔۔۔۔ ذرا ادھر دیکھو!''

مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اپنی پنڈلی کھجلاتی رہی۔

سریندر کو بہت الجھن ہوئی۔ اگر لڑکی کی بجائے کوئی کتا ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔ اگر اسے اس کی یہ آواز ناپسند ہوتی تو بھونکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ اگر سنی تھی تو ان سنی کردی تھی۔

سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا۔ ''اے لڑکی!''

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ جھنجھلا کر اس نے اپنا ململ کا کرتا پہنا اور نیچے اترا۔ جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اسی طرح اپنی ننگی پنڈلی کھجلا رہی تھی۔

سریندر اس کے پاس کھڑا ہوگیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی پنڈلی ڈھانپ لی۔

سریندر نے اس سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''بیٹھی ہوں۔''

''کیوں بیٹھی ہو؟''

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ '' لو، اب کھڑی ہوگئی ہوں!''

سریندر بوکھلا گیا۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟''

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنولا ہوگیا۔ ''تم چاہتے کیا ہو؟''

سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹٹولا۔ ''میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''مہربانی۔۔۔۔۔۔کاہے کی مہربانی۔۔۔۔۔۔چلو!''

اور دونوں چل دیے۔

جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوفے کی بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کھجلانے لگی۔ سرِیندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اس میں وہ تمام قوسیں اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کا مضبوط جسم اس کے باہر جھانک رہا تھا۔

سرِیندر نے اس سے کہا۔ ''یہاں کیوں بیٹھی ہو۔۔۔۔۔۔ ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ!''

لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا۔ ''نہیں!''

سرِیندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ ''تمہاری مرضی۔۔۔۔۔۔ لو اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور درخت کے نیچے تم اتنی دیر سے کیوں بیٹھی تھیں؟''

''میں کون ہوں اور درخت کے نیچے میں کیوں بیٹھی تھی۔۔۔۔۔۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔'' لڑکی نہ یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پائنچہ نیچے کرلیا اور پنڈلی کھجلانا بند کردی۔

سرِیندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں کا مقابلہ کررہا تھا جن سے اس کا دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں، جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکلیں۔ لیکن اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کسا ہوا تھا۔

سرِیندر نے ان ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھڑیوں میں لے جاتی تھیں۔ مگر سرِیندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کو اب خود کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کی تکنیک سے قطعات ناواقف تھا۔ بہر حال۔ اس نے اپنے ایک بازہ کو تیار کیا اور اسے لڑکی کی عمر میں حمائل کردیا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا۔ ''یہ کیا کررہے ہو تم؟''

سرِیندر ایک بار پھر بوکھلا گیا۔ ''میں۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔''

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''آرام سے بیٹھے رہو!''

سرِیندر آرام سے بیٹھ گیا۔ مگر اس کے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر سرِیندر کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ فرش پر چت گر پڑی۔ سرِیندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑا دھڑ اس کے گہرے سانولے ہونٹ چومنے شروع کردیے۔

لڑکی بے بس تھی۔ سرِیندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ بوجہ مجبوری وہ اس کے گیلے بوسے برداشت کرتی رہی۔

سرِیندر نے سمجھا کہ وہ رام ہوگئی ہے، چنانچہ اس نے مزید دراز دستی شروع کی۔ اس کی قمیض کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کردیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔

سرِیندر کو اب یقین ہوگیا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہے گا، چنانچہ اس نے دراز دستی چھوڑ دی اور اس سے کہا۔ ''چلو آؤ، پلنگ پر لیٹتے ہیں۔''

لڑکی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں پلنگ پر لیٹ گئے۔ ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سرِیندر سے پوچھا۔ ''میں کھالوں؟''

''ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ ایک نہیں سب کھالو!''

سرِیندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا، مگر لڑکی نے اس سے دونوں چیزیں لے لیں۔

''میں خود چھیلوں گی!''

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے۔ پھانکوں پر سے سفید سفید جھلی ہٹائی۔ پھر پھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک پھانک سرِیندر کو دی، دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے پاس پستول ہے؟''

سرِیندر نے جواب دیا۔ ''ہاں۔۔۔۔۔۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی ''میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو نا کہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔''

سرِیندر نے دوسرا مالٹا طشتری میں سے اٹھایا۔ ''آج سے ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ بہت دنوں سے ہو رہے

ہیں۔۔۔۔۔۔ میں اپنے پستول سے چار سلمان مار چکا ہوں۔۔۔۔۔۔ بڑے حولی م ے!''

''سچ؟'' یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے ذرا وہ پستول تو دکھانا!''

سرہندر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا۔ ''یہ لو۔۔۔۔۔۔ لیکن ٹھہرو!'' اور اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ٹھیک کردیا کیوں کہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔

لڑکی نے پستول پکڑا اور سرہندر سے کہا۔ ''میں بھی آج ایک مسلمان ماروں گی'' یہ کہہ کر اس نے سیفٹی کیچ کو ایک طرف کیا اور سرہندر پر پستول داغ دیا۔۔۔۔۔۔ وہ فرش پر گر پڑا اور جان کنی کی حالت میں کراہنے لگا۔ ''یہ تم نے کیا کیا؟''

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے، ان میں میرا باپ بھی تھا۔!''

یزید

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس موسم میں خلافِ معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد، مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں، صرف مقابلہ کرنے کے لیے نہیں۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا اُن کا، جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جاں بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا، کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا مرد کی توہین سمجھتا ہے۔ تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اُس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔

کریم داد، جمع، تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا، کتنا مالی، مگر کریم داد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم داد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریم داد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی۔ اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنائی تھی۔

گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل ہوئے تھے، کئی لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ بہت ہی ظالمانہ طریقے پر بے آبرو ہوئی تھی۔ جس کے بھی یہ زخم آئے تھے، روتا تھا، اپنے پھوٹے نصیبوں پر اور دشمنوں کی بے رحمی پر، مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اپنے باپ رحیم داد کی شہ زوری پر اسے ناز تھا۔ جب وہ پچیس تیس، برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح بلوائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا، اور کریم داد کو اس کی موت کی خبر ملی تھی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا۔ ''یار تم نے یہ ٹھیک نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو۔''

اور اس نے رحیم داد کی لاش اٹھا کر، کنویں کے پاس گڑھا کھود کر دفنا دی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ

لے طور پر صرف یہ چند الفاظ لیے ہوئے ''گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے۔ اچھا تجھے بہشت نصیب ہو!''
رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوسناک موت کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے، مگر کریم داد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہوئی تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ مگر اُس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا۔۔ ''جو کچھ ہوا ہے۔ ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔''
اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔
گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کرلی۔ اسی مٹیار جیناں کے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جیناں سوگوار تھی۔ اس کا شہتیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلووں میں مارا گیا تھا۔ ماں، باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کریم داد سے بےپناہ محبت تھی، مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کردی تھی، اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔
کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑ تھی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا، یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے۔ ممکن ہے اس کے دل کو اور بھی دکھ پہنچے، مگر ایک روز اس سے نہ رہا گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا۔۔۔۔۔۔ ''مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہوگیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ چھوڑ میری جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دیں۔''
جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئی تھیں۔ مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی ان باتوں میں معنی پیدا کیے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کرلیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔!

شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی۔ مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہوگئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جمے رہ سکے۔۔۔۔۔۔چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہوگیا۔ باجے گاجے آئے، ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔

فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑکا ہوا تو گاؤں میں کئی آدمی سہم سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں، کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اُس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔

کریم داد نے جیناں کی سُوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی، اور کہا۔ ''یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چمٹا رہے گا۔۔۔۔۔۔رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی۔''

جیناں نے اپنی مہندی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہا۔ ''مجھے تو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔''

کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرادیا۔۔۔۔۔۔''ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے!''

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہوچکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ کریم داد اس کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا۔ ''خدا کی قسم جیناں، تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائیگی۔''

یہ سن کر جیناں شرما کر اپنا ٹھلیا سا پیٹ چادر سے چھپا لیتی۔ کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا۔ ''چھپاتی کیوں ہو اس چور کو۔۔۔۔۔۔میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناؤ سنگھار صرف تم نے اسی سؤر کے بچے کے لیے کیا ہے۔''

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی۔ ''کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟''

کریم داد کی سیاہی مائل بھوری مونچھیں ہنسی سے تھر تھرانے لگتیں۔ ''کریم داد بہت بڑا سؤر ہے۔''

چھوٹی عید آئی۔ بڑی عید آئی، کریم داد نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیم داد اور جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہوئے تھے، جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کرکے بہت روتی تھی! مگر کریم داد کی صدموں کو یاد نہ رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کرسکی، جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہیے تھا۔

جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھولتی جارہی ہے۔ ماں باپ کی موت اس کو قطعاً یاد نہیں تھی۔ فضل الٰہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی۔ اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی، جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یکا یک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اسکے اثرات سے کتنی دور ہوتی جارہی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا اسے گھوڑا اور تعزیئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریم داد سے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے گھوڑا دکھانے؟''

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو لے چلوں گا۔۔۔۔۔۔اس سؤر کے بچے کو بھی!''

جیناں کو یہ گالی بہت ہی بُری لگتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پر خلوص تھا کہ جیناں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابل بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی کہ سؤر کے بچے میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھی۔ اصل میں تو پاکستان بنتے ہی بات گویا ایک طور پر طے ہوگئی تھی کہ جنگ ہوگی۔ اور ضرور ہوگی۔ کب ہوگی، اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا، تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا۔ ''جب ہونی ہوگی ہو جائے گی۔ فضول سوچنے سے کیا فائدہ!''

جیناں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی، تو اس کے اوسان خطا ہوجاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تُوتُو میں میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلووں میں نے اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے اور انہی میں اس کا پیارا بھائی فضل الٰہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کر وہ کریم داد سے صرف اتنا کہتی۔ ''کیمے، کیا ہوگا!''

کریم داد مسکرا دیتا۔ ''مجھے یا معلوم۔ لڑکا ہوگا لڑکی۔''

یہ سن کر جیناں بہت ہی زچ بچ ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں میں لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقت ور تھا، نڈر تھا، جیناں سے اس کو بے حد محبت تھی۔ بندوق خریدنے کے بعد وہ تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت پکا ہوگیا تھا۔ یہ سب باتیں جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں، مگر اس کے باوجود ترنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ ہمجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سنتی، تو ایک دم سُن سی ہو جاتی۔

بختو دائی جو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی۔ ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا۔ ''دریا بند کرنے والے ہیں؟۔۔۔۔۔ کون سے دریا بند کرنے والے ہیں۔''

بختو دائی نے جواب دیا۔ ''وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔''

جیناں نے کچھ دیر سوچا اور ہنس کر کہا۔ ''موسی تم بھی کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو، دریا کون بند کرسکتا

ہے۔۔۔۔۔۔ وہ بھی کوئی موریاں ہیں۔"

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔ "بی بی مجھے معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔ جو کچھ میں نے سنا تمہیں بتا دیا۔ یہ بات اب تو اخباروں میں بھی آگئی ہے۔"

"کون سی بات؟" جیناں کو یقین نہیں آتا تھا۔

بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھوں سے جیناں کا پیٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "یہی دریا بند کرنے والی" پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی قمیض کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کہا۔ "اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے!"

کریم داد گھر آیا، تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا۔ اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی، پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا۔ "ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔"

جیناں نے پوچھا۔ "کیا؟"

"یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کردیں گے۔"

"کیوں؟"

کریم داد نے جواب دیا۔ "کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔"

یہ سن کر جیناں کو یقین ہوگیا کہ دریا بند کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا۔ "کتنے ظالم ہیں یہ لوگ۔"

کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا۔ "ہٹاؤ اس کو۔ یہ بتاؤ موسی بختو آئی تھی۔"

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا۔۔۔۔۔۔ "آئی تھی!"

"کیا کہتی تھی؟"

"کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا۔"

کریم داد نے زور کا نعرہ لگایا۔ زندہ باد۔

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی۔ ''تمہیں خوشی سوجھتی ہے جانے یہاں۔ کیسی کربلا آنے والی ہے۔''

کریم داد چوپال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے۔ چودھری نتھو کو گھیرے، اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے، کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بددعائیں مانگ رہا تھا۔ کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریم داد ایک کونے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ کریم داد کچھ اس طرح باربار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہورہی ہے۔ سب یک زبان ہوکر یہ کہہ رہے تھے۔ کہ دریا بند کرنا بہت ہی اوچھا ہتھیار ہے۔ انتہائی کمینہ پن ہے۔ رذالت ہے۔ عظیم ترین ظلم ہے۔ بدترین گناہ ہے۔ یزیدپن ہے۔

کریم داد دو تین مرتبہ اس طرح کھانسا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کررہا ہے۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا۔ ''گالی نہ دے چودھری کسی کو۔''

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی، اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کررہا تھا۔ ''کیا کہا؟''

کریم داد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا۔ ''میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔''

حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا۔ ''کسی کو؟ کیا لگتے ہیں۔ وہ تمہارے؟''

اس کے بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ ''سنا تم لوگوں نے ۔۔۔۔۔۔ کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو ۔۔۔۔۔۔ پوچھو اس سے وہ کیا لگتے ہیں اس کے؟''

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''میرے کیا لگتے ہیں؟۔ میرے دشمن لگتے ہیں۔''
چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس قدر زور سے کہ اس کی مونچھوں کے بال بکھر گئے۔ ''سنا تم لوگوں نے۔ دشمن لگتے ہیں۔ اور دشمن کو پیار کرنا چاہیے۔ کیوں برخوردار؟''
کریم داد نے بڑے برخوردانہ انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں چودھری۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیے۔''
کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لنگوٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیوں؟''
کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا۔ ''کیا فائدہ ہے یار۔۔۔۔۔۔ وہ پانی بند کرکے تمہاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں۔ اور تم انھیں گالی دے کہ یہ سمجھتے ہو کہ حساب بیباق ہوا۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے۔ جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔''
میراں بخش نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس جواب ہے؟''
کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ''سوال میرا نہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔۔ ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدل سکتے۔ کئی سال لگیں گے۔ لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کررہے ہو۔'' پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ ''میں تو اتنا جانتا ہوں یار کہ ہندوستان کو کمینہ، رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے۔''
میراں بخش کے بجائے چودھری نتھو چلایا۔ ''لو اور سنو؟''
کریم داد، میراں بخش ہی سے مخاطب ہوا۔ ''دشمن سے میرے بھائی رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی رفلیں استعمال کررہا ہے۔ ہم چھوٹے بم گراتے ہیں، وہ بڑے گراتا ہے۔ تو اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے۔ چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور

بڑا چاقو بھی۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔''

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمیں بھوکا اور پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔''

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور چودھری نتھو سے مخاطب ہوا۔ ''چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گِلا کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں ویران اور بنجر نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پلاؤ کی دیگیں اور شربت کے مٹکے وہاں سے بھیجے گا۔ تمہاری سیر، تفریح کے لیے یہاں باغ بغیچے لگائے گا۔''

چودھری نتھو بھنا گیا۔ ''یہ تُو کیا بکواس کر رہا ہے؟''

میراں بخش نے بھی ہولے سے کریم داد سے پوچھا۔ ''ہاں یار یہ کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں ہے میراں بخشا۔'' کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا۔ ''تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، پہلوان جب لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اتر آئے تو اسے ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔''

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے!''

کریم داد مسکرایا۔ ''تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ ظلم ہے، مگر ان کے لیے روا ہے۔''

''روا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ جب تیری جیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آجائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا ناروا۔۔۔۔۔۔ جب تیرے بال بچے اناج کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہ کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا۔''

کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''میں جب بھی کہوں گا چودھری۔۔۔۔۔۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن ہے۔ کیا ہم اس کے دشمن نہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا، تو ہم نے

بھی اس کا دانہ پانی بند کیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ لیکن اب کہ وہ کرسکتا ہے، اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے۔۔۔۔۔۔ بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری نتھو۔۔۔۔۔۔ اس سے اگر ہوسکا تو وہ تمہارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملادے گا، تم اسے ظلم کہو گے، وحشیانہ پن کہو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔۔۔۔ عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھوائی جائیں۔۔۔۔۔۔ اس سے کہا جائے کہ دیکھو مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا، بندوق سے اور وہ بھی اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کرسکتے ہو۔ اصل بکواس تو یہ ہے۔۔۔۔۔۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔''

چودھری نتھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ ''برف لا کے رکھ میرے دل پر۔''

''یہ بھی میں ہی لاؤں۔'' یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ میراں بخش کے کاندھے پر تھپکی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔ گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی باہر نکلی۔ کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔۔۔۔۔۔

''مبارک ہو کیمے۔ چاند سا بیٹا ہوا ہے، اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا؟''

''نام؟'' کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا۔ ''یزید۔۔۔۔۔۔ یزید!''

بختو دائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کریم داد نعرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔ پہلے سے کسی قدر زرد، اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چپڑ چپڑ انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''اوئے میرے یزید!''

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی۔۔۔۔۔۔ ''یزید؟''

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یزید۔۔۔۔۔۔ یہ اس کا نام ہے۔''

جیناں کی آواز بہت نحیف ہوگئی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے؟۔۔۔۔۔۔ یزید''

کریم داد مسکرایا۔ کیا ہے اس میں؛ نام ہی تو ہے!

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی۔ ''مگر کس کا نام؟''

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ '' ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔۔۔۔۔۔ اُس نے دریا کا پانی بند کیا تھا۔۔۔۔۔۔یہ کھولے گا!''

4 اکتوبر 1951ء

اللہ داتا

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دوست ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے۔ ان کے آباؤ اجاد البتہ لاہور کے تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپڑاسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی۔۔۔۔۔۔زینب۔۔۔۔۔۔ اس کی شادی ہوچکی تھی مگر اپنے گھر میں اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس کا خاوند اوباش تھا۔ پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جارہی تھی۔ زینت اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا، چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے ۔ دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت و آبرو پر حملہ ہوگا اور انھیں افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی۔۔۔۔۔۔ مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا، کون سے درخت سے کون سی ٹہنی ٹوٹی۔۔۔۔۔۔ جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کردیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کردیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اسلی لڑکی زینب۔۔۔۔۔۔ کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کے بیٹھ رہے۔۔۔۔۔۔ پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے۔ پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے۔ آخر خدا نے سنی۔ اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا۔ طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر تھا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا۔ بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یے تک کہہ سنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انھوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔ اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغریٰ بڑے سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی، سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کے لاتی۔ چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لیے پورا ہو جائے۔ آٹا گوندھتی۔ پاس ہی تنور تھا، وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیوں کہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں

جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا تھا کہ زینت کا کام کچھ ہلکا ہو جائے۔ وقت ملتا تو دو تین گھڑے بھر کر گھڑونچی پر رکھ دیتا تھا۔

زینت نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔۔۔۔۔۔ طفیل کے سامنے بھی۔ اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ صرف احترام کے لیے۔۔۔۔۔۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی تھی۔ ''یا پروردگار۔۔۔۔۔۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔''

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا۔ غریب صغریٰ کے سر پر غم و اندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔

جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لُو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا۔ ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔

صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہوگئی۔ اس نے قریب قریب آدھے بال نوچ ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔۔۔۔۔۔ وہ تو ایسی کشتی کے مانند تھی جو اس کا بادبان ہو نہ کوئی پتوار اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہوئی۔

پٹیالہ کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی، فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال میں جا کر انھوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفنا آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہر، وہ لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا، بہلایا۔ سینے کے ساتھ لگایا، پیار کیا۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا۔ ''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔۔۔۔۔۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔۔۔۔۔۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔''

افسر صاحب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔۔۔۔۔۔ طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا۔''

اللہ دتا نے کہا۔ ''حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلد!''

افسر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ''بڑا نیک ارادہ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو، اس کا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ تم شادی کا بندوبست کرو۔ مجھے تاریخ سے مطلع کردینا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بات درست تھی۔ اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا۔ زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی؟

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا۔ ''ارے بابا، آنا جانا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی۔ صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا۔''

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی۔ ''صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔'' ایک دم چونک کر۔ ''ہاں۔۔۔۔۔۔ صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔ پر وہ کہاں ہے؟''

''وہیں ہے۔۔۔۔۔۔ پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں، ان کے پاس ہے۔ انھوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لو گے تو لے جانا'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟''

اللہ دتہ نے زور کا کش لگایا۔ ''ارے بھئی، اپنا طفیل۔۔۔۔۔۔ میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔۔۔۔۔۔ میں اسے کیا غیروں کے حوالے کردوں گا؟''

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تو صغریٰ کی شادی تم طفیل سے کرو گے؟''

اللہ دتا نے جواب دیا۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟
زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ہاں۔۔۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو، کیوں ہے۔۔۔۔۔۔ یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی!''
اللہ دتا مسکرایا۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا منہ چوما۔ ''پگلی۔۔۔۔۔۔ ہر بات پر شک کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں۔''
زینب نے بڑے زور سے ہونہہ کی۔ ''باپ!'' اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی۔
اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا۔
دن گزرتے گئے۔ طفیل فرمانبردار لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات تو وہ فوراً مان گیا۔ آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہوگئی۔۔۔۔۔۔ افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لیے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔
صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انھوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کردیا۔
صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہوگئے ہیں اور اس کو پیس رہے ہیں۔ بہر حال، وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہوگیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔
صغریٰ کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہ پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کردیے۔ جھاڑو وہ دیتی۔ برتن وہ مانجھتی۔ چولہا وہ جھونکتی۔ پانی وہ بھرتی۔ یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی، لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتی ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔
صغریٰ نے دل میں تہیہ کرلیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی، کیوں کہ اگر اسے یہاں سے دھکّا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔
اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھار وہ اس کو پیار کرلیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہا۔ ''صغریٰ، تم بڑی پیاری ہو!''

صغریٰ جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پُرجوش پیار کی عادی نہیں تھی۔ اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا۔ ''خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔''

صغریٰ طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کماتا تھا، اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی، اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینت کی بدسلوکی اور اس کے ساس ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ صلح کل تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور تو اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی، اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کی۔ اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی۔ ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا، لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے کیوں کہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لیے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی، اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی، اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ تڑپ کر اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا۔ ''شور مت مچاؤ۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔۔۔۔۔۔ چلو آؤ!''

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا

کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آگئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا۔ ''ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ۔۔۔۔۔۔ زینب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگیں۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا۔ ''کیابات ہے؟ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو؟''

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کردیا۔ زینب آگ بگولا ہوگئی۔ ''کیا ایک کافی نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ تمہیں تو شرم نہ آئی، پر اب تو آنی چاہیے تھی۔۔۔۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہوگا، اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی۔۔۔۔۔۔ اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!''

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا۔ ''کیوں؟''

زینب نے کھلے طور پر کہا۔ ''میں اس گھر میں اپنی سوتن دیکھنا نہیں چاہتی!''

اللہ دتا کا حلق خشک ہوگیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔۔۔۔۔۔ صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

انجام بخیر

بٹوارے کے بعد جب فرقہ وارانہ فسادات شدت اختیار کر گئے اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے زمین رنگی جانے لگی تو نسیم اختر جو دہلی کی نوخیز طوائف تھی اپنی بوڑھی ماں سے کہا ''چلو ماں یہاں سے چلیں''

بوڑھی بائکہ نے اپنے پوپلے منہ میں پاندان سے چھالیہ کے باریک باریک ٹکڑے ڈالتے ہوئے اُس سے پوچھا ''کہاں جائیں گے بیٹا ___''

پاکستان۔ یہ کہہ کر وہ اپنے استاد خان صاحب اچھن خان سے مخاطب ہُوئی۔

''خان صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں۔''

خان صاحب نے نسیم اختر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تم کہتی ہو مگر بائی جی کو منا لو تو سب چلیں گے۔

نسیم اختر نے اپنی ماں سے بہتر کہا۔ کہ چلو اب یہاں ہندوؤں کا راج ہوگا۔ کوئی مسلمان باقی نہیں چھوڑیں گے۔

بڑھیا نے کہا تو کیا ہوا۔ ہمارا دھندہ تو ہندوؤں کی بدولت ہی چلتا ہے اور تمہارے چاہنے والے بھی سب کے سب ہندو ہی ہیں مسلمانوں میں رکھا ہی کیا ہے''

''ایسا نہ کہو۔ ان کا مذہب اور ہمارا مذہب ایک ہے۔ قائد اعظم نے اتنی محنت سے مسلمانوں کے لیے پاکستان بنایا ہے ہمیں اب وہیں رہنا چاہیے۔''

مانڈو میراثی نے افیم کے نشہ میں اپنا سر ہلایا اور غنودگی بھری آواز میں کہا۔

''چھوٹی بائی۔ اللہ سلامت رکھے تمھیں کیا بات کہی ہے۔ میں تو ابھی چلنے کے لیے تیار ہوں میری قبر بھی بناؤ تو رُوح خوش رہے گی۔''

دوسرے میراثی تھے وہ بھی تیار ہو گئے لیکن بڑی بائی دلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی بالا خانے پر اُسی کا حکم چلتا تھا۔ اس لیے سب خاموش ہو گئے۔

بڑی بائی نے سیٹھ گوبند پرکاش کی کوٹھی پر آدمی بھیجا اور اُس کو بُلا کر کہا:

''میری بچی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ پاکستان جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے سمجھایا۔ وہاں کیا دھرا ہے۔ یہاں آپ ایسے مہربان سیٹھ لوگ موجود ہیں وہاں جا کر ہم اُپلے تھاپیں گے آپ ایک کرم کیجیے۔''

سیٹھ بڑی بائی کی باتیں سُن رہا تھا مگر اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر اُس نے بڑی بائی سے پوچھا۔

''تو کیا چاہتی ہے''

ہمارے لوتھے لے سچے دو تین ہندوؤں والے سپاہیوں کا پہرا لھڑا لردیجیے تالہ بچی کا سہم دور ہو۔

سیٹھ گوبند پرکاش نے کہا۔ یہ کوئی مشکل نہیں۔ میں ابھی جا کر سپرینٹنڈنٹ پولیس سے ملتا ہوں شام سے پہلے پہلے سپاہی موجود ہوں گے۔

نسیم اختر کی ماں نے سیٹھ کو بہت دُعائیں دیں۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے کہا ہم آپ اپنی بائی کا مجرا سُننے آئیں گے۔

بڑھیا نے اُٹھ کر تعظیماً کہا "۔ ہائے جم جم آئیے آپ کا اپنا گھر ہے بچی کو آپ اپنی قیمص سمجھیے کھانا یہیں کھائیے گا۔

"نہیں میں آجکل پرہیزی کھانا کھارہا ہوں ___ یہ کہہ کر وہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا۔

شام کو نسیم کی ماں نے چاندنیاں بدلوائیں گاؤتکیوں پر نئے غلاف چڑھائے زیادہ روشنی کے بلب لگوائے اعلیٰ قسم کے سگرٹوں کا ڈبہ منگوانے بھیجا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نوکر حواس باختہ ہانپتا کانپتا واپس آگیا۔ اُس کے منہ سے ایک بات نہ نکلتی تھی۔ آخر جب وہ کچھ دیر کے بعد سنبھلا تو اُس نے بتایا کہ چوک میں پانچ چھ سکھوں نے ایک مسلمان خوانچہ فروش کو کرپانوں سے اُس کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا ہے جب اُس نے یہ دیکھا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور یہاں آن کے دم لیا۔

نسیم اختر یہ خبر سُن کر بے ہوش ہوگئی۔ بڑی مشکلوں سے خان صاحب اچھن خان اُسے ہوش میں لائے مگر وہ بہت دیر تک نڈھال رہی اور خاموش خلا میں دیکھتی رہی۔ آخر اُس کی ماں نے کہا " خون خرابے ہوتے ہی رہتے ہیں " کیا اس سے پہلے قتل نہیں ہوتے تھے۔

دم دلاسہ دینے کے بعد نسیم اختر سنبھل گئی تو اُس کی ماں نے اُس سے بڑے دُلار اور پیار سے کہا۔

"اٹھو میری بچی جاؤ پشواز پہنو سیٹھ آتے ہی ہوں گے۔

نسیم نے بادل نخواستہ پشواز پہنی سولہ سنگھار کیے اور مسند پر بیٹھ گئی اُس کا جی بھاری بھاری تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اُس مقتول خوانچہ فروش کا سارا خون اُس کے دل و دماغ میں جم گیا ہے اُس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ زرق برق پشواز کی بجائے سادہ شلوار قمیص پہن لے اور اپنی ماں سے ہاتھ جوڑ کر بلکہ اُس کے پاؤں پڑ کر کہے کہ خدا کے لیے میری بات سُنو اور بھاگ چلو یہاں سے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم پر کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔

بُڑھیا نے جھنجھلا کر کہا۔ ہم پر کیوں آفت آنے لگی ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے ___"

نسیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا اس غریب خوانچہ فروش نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ظالموں نے اُس کے ٹکڑے

ٹکڑے کر ڈالے۔ بگاڑنے والے بچ جاتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں جنہوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہوتا___

تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

ایسے حالات میں کس کا دماغ دُرست رہ سکتا ہے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں یہ کہہ کر وہ اُٹھی۔ بالکونی میں کھڑی ہوگئی اور نیچے بازار میں دیکھنے لگی۔ اسے بجلی کے کھمبے کے پاس چار آدمی کھڑے دکھائی دیے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں اُس نے خان اچھن کو بتایا اور وہ آدمی دکھائے ایسا لگتا تھا کہ وہی سپاہی ہیں جن کو سیٹھ نے بھیجا ہوگا۔

خان صاحب نے غور سے دیکھا۔

''نہیں یہ سپاہی نہیں۔ سپاہیوں کی تو وردی ہوتی ہے مجھے تو یہ گُنڈے معلوم ہوتے ہیں۔

نسیم اختر کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ''گُنڈے''

اللہ بہتر جانتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا لو یہ تمہارے کوٹھے کی طرف آرہے ہیں۔ دیکھ نسیم کسی بہانے سے اُوپر کوٹھے پر چلی جاؤ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔

نسیم اختر چپکے سے باہر نکلی اور اپنی ماں سے نظر بچا کر اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خان صاحب اچھن خان اپنی چندھی آنکھیں جھپکاتا اُوپر آیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

نسیم اختر جس کا دل جیسے ڈُوب رہا تھا۔ خانصاحب سے پوچھا۔

''کیا بات ہے''

وہی جو میں نے سمجھا تھا۔ تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے کہتے تھے سیٹھ گوبند پرکاش نے کار بھیجی ہے اور بلوایا ہے۔ تمہاری ماں بڑی خوش ہوئی بڑی مہربانی ہے اُن کی۔ میں دیکھتی ہوں کہاں ہے شاید غسل خانے میں ہو۔ اتنی دیر میں میں تیار ہو جاؤں''

ان گنڈوں میں سے ایک نے کہا ''تمھیں کیا شہد لگا کر چاٹیں گے بیٹھی رہو جہاں بیٹھی ہو خبردار جو تم وہاں سے ہلیں ہم خود تمہاری بیٹیوں کو ڈھونڈ نکالیں گے''

میں نے جب یہ باتیں سُنیں اور ان گُنڈوں کے بِگڑے ہوئے تیور دیکھے تو کھسکتا کھسکتا یہاں پہنچ گیا ہوں___''

نسیم اختر حواس باختہ تھی۔ اب کیا کیا جائے۔؟

خان نے اپنا سر کھجایا اور جواب دیا___ ''دیکھو میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں بس یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔

اور ماں ____''

اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس کو اللہ کے حوالے کر کے خود باہر نکلنا چاہیے اُوپر چارپائی پر دو چادریں پڑی ہوئی تھیں خان صاحب نے ان کو گانٹھ دے کر رسہ سا بنایا اور مضبوطی سے ایک گنڈے کے ساتھ باندھ کر دوسری طرف لٹکایا نیچے لانڈری کی چھت تھی وہاں اگر وہ پہنچ جائیں تو راستہ آگے صاف ہے لانڈری کی چھت کی سیڑھیاں دوسری طرف تھیں اُس کے ذریعے سے وہ طویلے میں پہنچ جاتے اور وہاں سائیں سے جو مسلمان تھا تانگہ لیتے اور اسٹیشن کا رُخ کرتے۔

نسیم اختر نے بڑی بہادری دکھائی۔ آرام آرام سے نیچے اُتر کر لانڈری کی چھت تک پہنچ گئی۔ خانصاحب اچھن خان بھی بحفاظت تمام اُتر گئے۔ اب وہ طویلے میں تھے سائیں اتفاق سے تانگے میں گھوڑا جوت رہا تھا دونوں اُس میں بیٹھے اور اسٹیشن کا رخ کیا مگر راستے میں ان کو ملٹری کا ٹرک مل گیا اُس میں مسلح فوجی مسلمان تھے جو ہندوؤں کے خطرناک محلوں سے مسلمانوں کو نکال نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا رہے تھے جو پاکستان جانا چاہتے ان کو اسپیشل ٹرینوں میں جگہ دلوا دیتے۔

تانگہ سے اُتر کر نسیم اختر اور اُس کا اُستاد ٹرک میں بیٹھے اور چند ہی منٹوں میں اسٹیشن پر پہنچ گئے اسپیشل ٹرین اتفاق سے تیار تھی اس میں ان کو اچھی جگہ مل گئی اور وہ بخیریت لاہور پہنچ گئے یہاں وہ قریب قریب ایک مہینے تک والٹن کیمپ میں رہے۔ نہایت کسمپرسی کی حالت میں اس کے بعد وہ شہر چلے آئے نسیم اختر کے پاس کافی زیور تھا جو اُس نے اُس رات پہنا ہوا تھا جب سیٹھ گوبند پرکاش اُس کا مجرا سُننے آرہا تھا یہ اُس نے اُتار کر خان صاحب اچھن خان کے حوالے کر دیا تھا ان زیوروں میں سے کچھ بیچ کر اُنھوں نے ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا لیکن مکان کی تلاش جاری رہی آخر بدقت تمام ہیرا منڈی میں ایک مکان مل گیا جو اچھا خاصہ تھا اب خانصاحب اچھن خان نے نسیم اختر سے کہا ''گدے اور چاندنیاں وغیرہ خرید لیں اور تم بسم اللہ کر کے مجرا شروع کر دو۔''

نسیم نے کہا۔ ''نہیں خان صاحب میرا جی اکتا گیا ہے میں تو اس مکان میں بھی رہنا پسند نہیں کرتی کسی شریف محلے میں کوئی چھوٹا سا مکان تلاش کیجیے۔ کہ میں وہاں اُٹھ جاؤں میں اب خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔

خان صاحب کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ کیا ہوگیا ہے تمھیں''

بس جی اچاٹ ہوگیا ہے میں اس زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں دعا کیجیے خدا مجھے ثابت قدم رکھے'' یہ کہتے ہوئے نسیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

خانصاحب نے اس کو بہت ترغیب دی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ایک دن اس نے اپنے استاد سے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کر لینا چاہتی ہے اگر کسی نے اسے قبول نہ کیا تو وہ کنواری رہے گی۔

خان صاحب بہت حیران تھا۔ کہ نسیم میں یہ تبدیلی کیسے آئی فسادات تو اس کا باعث نہیں ہوسکتے پھر کیا وجہ تھی کہ وہ پیشہ ترک کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

جب وہ اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تو اسے ایک محلے میں جہاں شرفاء رہتے تھے ایک چھوٹا سا مکان لے دیا اور خود ہیرا منڈی کی ایک مالدار طوائف کو تعلیم دینے لگا۔ نسیم نے تھوڑے سے برتن خریدے ایک چارپائی اور بستر وغیرہ بھی ایک چھوٹا لڑکا نوکر رکھ لیا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگی پانچوں نمازیں پڑھتی۔ ''

روزے آئے تو اس نے سارے کے سارے رکھے ایک دن وہ غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ سب کچھ بھول کر اپنی سُریلی آواز میں گانے لگی اُس کے ہاں ایک اور عورت کا آنا جانا تھا نسیم اختر کو معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت شریفوں کے محلے کی بہت بڑی پھپھا کٹنی ہے شریفوں کے محلے میں کئی گھر تباہ و برباد کر چکی ہے کئی لڑکیوں کی عصمت اونے پونے داموں بکوا چکی ہے کئی نوجوانوں کو غلط راستے پر لگا کر اپنا الو سیدھا کرتی رہتی ہے جب اُس عورت نے جس کا نام جنتے ہے نسیم کی سُریلی اور منجھی ہوئی آواز سُنی تو اُس کو فوراً خیال آیا کہ اس لڑکی کا آگا ہے نہ پیچھا بڑی معرکے کی طوائف بن سکتی ہے چنانچہ اُس نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اس کو اس نے کئی سبز باغ دکھائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئی آخر اُس نے ایک روز اس کو گلے لگایا اور چٹ چٹ اس کی بلائیں لینا شروع کر دیں۔ جیتی رہو بیٹا۔ میں تمہارا امتحان لے رہی تھی تم اس میں سولہ آنے پوری اُتری ہو۔ نسیم اختر اس کے قریب میں آگئی ایک دن اُس کو یہاں تک بتا دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے کیونکہ ایک یتیم کنواری لڑکی کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

جنتے کو موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے نسیم سے کہا۔ بیٹا یہ کیا مشکل ہے میں نے یہاں شادیاں کرائی ہیں سب کی سب کامیاب رہی ہیں اللہ نے چاہا تو تمہارے حسب منشا میاں مل جائے گا جو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئے گا۔

جنتے کئی فرضی رشتے لائی مگر اُس نے ان کی کوئی زیادہ تعریف نہ کی آخر میں وہ ایک رشتہ لائی جو اس کے کہنے کے مطابق فرشتہ سیرت اور صاحب جائیداد تھا نسیم مان گئی تاریخ مقرر کی گئی اور اُس کی شادی انجام پا گئی۔

نسیم اختر خوش تھی کہ اس کا میاں بہت اچھا ہے اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا ہے لیکن اُس دن اُس کے ہوش و حواس گم ہوگئے جب اُس کو دوسرے کمرے سے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں دروازے میں سے جھانک کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر دو بوڑھی طوائفوں سے اُس کے متعلق باتیں کر رہا ہے جنتے بھی پاس بیٹھی تھی یہ سب مل کر اس

کا سودا طے کر رہے تھے اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے اور کیا نہ کرے بہت دیر روتی سوچتی رہی آخر اُٹھی اور اپنی پشواز نکال کر پہنی اور باہر نکل کر سیدھی اپنے اُستاد اچھن خان کے پاس پہنچی اور مجرے کے ساتھ ساتھ پیشہ بھی شروع کر دیا ایک انتقامی قسم کے جذبے کے تحت وہ کھیلنے لگی۔

بائی بائی

نام اس کا فاطمہ تھا' پر سب اسے پھاتو کہتے تھے' بانہال کے درّے کے اُس طرف اُس کے باپ کی پن چکّی تھی جو بڑا سادہ لوح معمّر آدمی تھا۔

دن بھر وہ اس پن چکّی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پن چکّی لگائی گئی تھی۔ پھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے جو اس کے لیے کافی تھے۔ پھاتو البتہ ان کو ناکافی سمجھتی تھی اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی' بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اس کو آٹے سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ وہ اُڑ اُڑ کر اس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی' یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔

اس کو چناب سے پیار تھا' اُس نے اپنی سہیلیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے جہاں سوہنی مہینوال' ہیر رانجھا کا عشق مشہور ہوا۔

بہت خوبصورت تھی اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پن چکی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی' میلی شلوار اوپر 'پھرن' 'کُرتہ --- دوپٹہ ندارد۔

نذیرؔ سچیت گڑھ سے لے کر بانہال تک اور بھدرواہ سے کشتواڑ تک خوب گھوما پھرا تھا۔ اس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اسے کوئی حیرت نہ ہوئی جب اُس نے دیکھا کہ پھاتو کے کرتے کے نچلے تین بٹن نہیں ہیں اور اس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں۔

نذیر نے اُس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کُرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے بٹن غائب ہوتے ہیں' اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا یہ دانستہ ہٹا دیے جاتے ہیں یا وہاں کے دھوبی ہی ایسے ہیں جو ان کو اُتار لیتے ہیں۔

نذیر نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پھاتو کو اپنی تین کم بٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ حسین تھی' ناک نقشہ بہت اچھا تھا' تعجب ہے کہ وہ میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی' اس کا لباس بہت گندا تھا مگر نذیر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہی اس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔

نذیر وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا' وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور ان کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔ اُس نے کشتواڑ دیکھا' بھدرواہ دیکھا' کُد اور بٹوت میں کئی مہینے

گزارے مگر اسے پھاتو ایسا حسن نہیں نظر نہیں آیا تھا۔

بانہال میں پن چکی کے باہر جب اس نے پھاتو کو تین بٹنوں سے بے نیاز کرتے میں دیکھا تو اس کے جی میں آیا کہ اپنی قمیص کے سارے بٹن علیحدہ کر دے اور اُس کی قمیص اور پھاتو کا کُرتہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔

اُس سے ملنا نذیر کے لیے مشکل نہیں تھا' اس لیے کہ اس کا باپ دن بھر گندم' مکئی اور جوار پیسنے میں مشغول رہتا تھا اور وہ تھی ہنس مکھ' ہر آدمی سے کھل کر بات کرنے والی۔ بہت جلد گُھلو مٹھو ہو جاتی تھی چنانچہ نذیر کو اس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقّت محسوس نہ ہوئی۔ چند ہی دنوں میں اس نے اس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔

یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی' پاس ہی چناب جسے عشق کا دریا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے پھاتو کے باپ کی پن چکی چلتی تھی' اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذیر اس کو اپنا دل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھاتو سنتی ۔ اس لیے کہ وہ اس کے جذبات کا مذاق اُڑانا چاہتی تھی ___ اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی' اس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روئی۔

نذیر اور پھاتو میں محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ نذیر پھاتو کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اُس نے اپنی روح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے اور پھاتو تو اس کی گرویدہ تھی اس لیے کہ وہ اس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا اُس کو یہ چیز ___ جسے محبت کہتے ہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی' اس لیے وہ خوش تھی۔

بانہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے نذیر کو بٹوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانہ کے اندر بیٹھا رہتا' ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پن چکی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے۔

جب وہ پن چکی کے پاس پہنچتا تو پھاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پتھروں پر بیٹھ جاتے۔

پھاتو اس سے کہتی ''بخیر۔ آج کی خبریں سناؤ''

اس کو خبریں سننے کا خبط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اس کو خبریں سُنانا شروع کر دیتا۔ ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ امرتسر سے یہ قصہ شروع ہوا تھا جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کر راکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اس کو سناتا' وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں برا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا مگر جب اس نے پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگرول اور ماناواوار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا مگر اس نے اپنی اس پریشانی کو پھاتو پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا اس کا علم پھاتو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز اور شریف گھرانے میں جائے گی مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے جہاں کا نذیر رہنے والا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اس کے پاس رہے۔

دولت مند کا بیٹا ہے۔ پن چکی کے پاس کافی زمین پڑی ہے' اس پر ایک چھوٹا سا مکان بنوا لے اور دونوں میاں بیوی اس میں رہیں' جب چاہا پلک جھپکتے سرینگر پہنچ گئے' وہاں ایک دو مہینے رہے' پھر واپس آ گئے' کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دُور نہیں۔

پھاتو کے باپ سے مفصل گفتگو کی' وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور پھاتو بہت خوش ہوئے' اس روز پہلی مرتبہ نذیر نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے کرتے میں تین بٹن لگائے۔

دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے جس سے اُس کی محبت ہو گئی ہے' ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی' آدمی روشن خیال تھے' اس لیے وہ مان گئے حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔

اس کے والد نے جو آخری خط لکھا اس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر فاطمہ کا فوٹو بھیجے تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں کو دکھائیں اس لیے کہ وہ اس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

لیکن بانہال جیسے دُور افتادہ علاقے میں وہ پھاتو کی تصویر کیسے حاصل کرتا اس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا نہ وہاں کوئی فوٹو گرافر' بٹوت اور کُد میں بھی ان کا نام و نشان نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سرنگر سے موٹر آئی' نذیر سڑک پر کھڑا تھا اس نے دیکھا کہ اس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیو کر رہا ہے' اس نے بلند آواز میں کہا: ''رنبیر یار۔ ٹھہرو''

موٹر ٹھہر گئی' دونوں دوست ایک دوسرے کو گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اس کی موٹر میں کیمرہ پڑا ہے' رولی فیکس۔ نذیر نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں' پھر پوچھا ''تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟''

رنبیر نے ہنس کر کہا ''خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے' میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوزر موجود ہیں''
نذیر نے فوراً پھاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا : ''یار اس کے تین چار اچھے پوز لے لو اور تم میرا خیال ہے سیالکوٹ جا رہے ہو' وہاں سے ڈویلپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں بٹوت کے ڈاکخانے کی معرفت بھجوا دینا''

رنبیر نے بڑے غور اور دلچسپی سے پھاتو کو دیکھا اُس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے' تھری ناٹ تھری بندوقیں لیے۔ رنبیر جو مقام فوٹو لینے کے لیے پسند کرتا یہ مسلح فوجی اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر اس کے ہمراہ ہونا چاہتا تو یہ ڈوگرے اسے روک دیتے۔ کشمیر میں ہلڑمچ رہا تھا اس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔ فوٹو لے کر جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موٹر کے پاس آیا تو اس نے نذیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا' پھاتو ڈوگرے فوجیوں کی گرفت میں تھی' انھوں نے زبردستی موٹر میں ڈالا' وہ چیخی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ مگر وہ عاجز تھا۔ ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔

جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا : ''یار رنبیر! یہ کیا ہو رہا ہے''
رنبیر سنگھ نے جو کہ موٹر چلا رہا تھا' نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کہ صرف اتنا کہا :

''بائی بائی''

۱۱، مئی ۴۵ء

مائی نانکی

اس دفعہ میں ایک عجیب سی چیز کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ ایسی چیز جو ایک ہی وقت میں عجیب و غریب اور زبردست بھی ہے۔ میں اصل چیز لکھنے سے پہلے ہی آپ کو پڑھنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں آپ کل کو نہ کہہ دیں کہ ہم نے چند پہلی سطور ہی پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ خشک سی تھیں۔ آج اس بات کو قریب قریب تین ماہ گزر گئے ہیں کہ میں مائی نانکی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی سے اُسے لکھ دُوں تاکہ آپ بھی مائی نانکی کی عجیب و غریب اور پُر اسرار شخصیت سے واقف ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ اس سے پہلے بھی مائی نانکی کو جانتے ہوں۔ کیونکہ اسے کشمیر اور جموں کشمیر کے علاقے کے سبھی لوگ جانتے ہیں۔ اور لاہور میں سید مٹھا اور ہیرا منڈی کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگ بھی۔ کیونکہ اصل میں وہ رہنے والی جموں کی ہے اور آج کل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک اندھیرے کونے میں رہتی ہے۔

لہٰذا بہت ممکن ہے کہ آپ بھی جموں یا ہیرا منڈی کے گرد و نواح میں رہتے ہوں اور مائی نانکی سے واقف ہوں۔ لیکن میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سی عورتیں دیکھی ہیں اور بڑی بڑی زہریلی قسم کی عورتیں لیکن میں آج تک کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا اُس عورت سے۔ جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں وہ جموں کی رہنے والی ہے۔ وہاں وہ ایک دایہ کا کام کرتی تھی۔ اور اس کے کہنے کے مطابق وہ جموں اور کشمیر کی سب سے بڑی دایہ تھی۔ وہاں کے سب سے بڑے ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے ہاں اس کا ہی چرچا رہتا تھا۔ اور جہاں کہیں کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوتا تو فوراً اُسے بُلایا جاتا۔

اس کے علاوہ وہاں کے بڑے بڑے راجے، مہا راجے، نواب، جج وکیل اور ملٹری کے بڑے بڑے افسر سب اس کے مداح اور مرید تھے۔ انھوں نے آج تک نہ کبھی اس کی بات ٹالی اور نہ اسے ناراض کیا۔ بلکہ جب بھی اُس کا جی چاہا اُس نے اُن سے ہزارہا قسم کے کام نکالے۔ اس کے علاوہ وہ غالباً روزانہ اپنے کام سے تین چار سو روپے کے قریب کما لیتی تھی۔ روزانہ ان گنت بچے جناتی۔ ان میں کئی ایک مردہ۔ کئی ست ماہے اور باقی ٹھیک ٹھاک ہوتے۔ اس کے علاوہ وہاں اُس کا عالیشان مکان اور دو دکانیں تھیں۔ ایک طویلہ جس میں بارہ مہینے پانچ سات گائیں بھینسیں بندھی رہتیں ___ اس کا کنبہ جو ۲۵ افراد پر مشتمل تھا سب دُودھ مکھن کھاتے اور موج میں رہتے۔

کنبے کے لفظ پر ایک لطیفہ سنتے چلیے۔ اس کے کنبے کے سبھی آدمی اُس کے گھر کے نہیں تھے۔ ان پچیس افراد میں

سے اس کا نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی، ماں نہ بہن صرف وہ ایک خود تھی یا اس کا شوہر اور باقی سب لڑکے لڑکیاں اس نے دوسروں سے لے کر پالے ہوئے تھے۔

میں نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ تم دوسروں کے بچے جناتی رہیں لیکن خود کیوں نہ جنا؟'' کہنے لگی '' ایک ہوا تھا میں نے اُسے مار دیا '' میں نے پوچھا '' کیوں؟'' کہنے لگی '' میری طبیعت کو اس کا رونا ناگوار گزرا تھا۔ بڑا خوبصورت تھا لیکن میں نے اُسے زمین پر رکھا اور اوپر سے لحاف اور رضائیوں کا ایک انبار گرا دیا اور وہ نیچے ہی دم گھٹ کے مر گیا۔ ''

میں اُس کی زُبانی اس کے حالات آپ کو بتا رہا تھا اُس کے علاوہ وہ کہتی کہ میرے پاس کم از کم پچیس تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی تھا۔ بقول اُس کے وہ بڑی موج میں رہ رہی تھی کہ اچانک ہندوستان تقسیم ہوگیا اور کشمیر میں قتل و غارت شروع ہوئی۔ ڈوگرے مسلمانوں کو چن چن کے قتل کرنے لگے۔ چنانچہ اسی افراتفری میں اُس نے اپنا گھر چھوڑا کیونکہ اس کے محلے میں بھی قتل و خون اور عصمت دری شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں اس کے گھر کے سبھی آدمی اسے چھوڑ گئے اور وہ اکیلی جان بچانے کو عیسائیوں کے محلے میں جا گھسی۔ آپ حیران ہوں گے وہ اس قیامت کے سمے میں بھی اپنا زیور اور گائے بھینس اور ضروری کپڑے اور سامان وغیرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی اور وہاں سکونت پذیر ہوئی۔ لیکن جس واقف کار کے ہاں وہ ٹھہری تھی اُسے دوسرے روز اُس نے کہا کہ مائی ہم کو بھی قتل کروانے کی ٹھانی ہے۔ تم اپنا زیور سامان اور گائے بھینس یہیں چھوڑ کر پاکستان چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں کسی ڈوگرے نے دیکھ لیں تو تم کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ وہ وہاں سے صرف اپنا دن رات کا رفیق حقہ اُٹھا کر باہر نکلی تھی کہ ساتھ والی عیسائن نے کہا '' مائی تم میرے گھر میں آرہو۔ اگر کوئی تمھیں مارنے آیا تو پہلے ہم کو مارے گا۔ وہ رضامند ہو گئی لیکن اُسی شام کو جموں کے مہاراجہ کا بھیجا ہوا ایک سپاہی آیا اور اُس نے اُس عیسائن سے سوال کیا ''کیا دائی نانکی یہیں ہے '' عیسائن نے جواب دیا کہ نہیں وہ یہاں کہاں۔ سپاہی اور عیسائن کے سوال و جواب وہ خود اندر سُن رہی تھی اور وہ کہتی ہے کہ میں خود باہر آئی اور سپاہی سے کہا '' میں ہوں مہاراج۔ مائی نانکی میرا ہی نام ہے '' سپاہی کہنے لگا '' مہاراج کہتے ہیں نانکی یہیں ہمارے پاس رہے گی۔ پاکستان نہیں جائے گی اُس نے بتایا کہ سپاہی کا یہ فقرہ سُن کر مجھے جلال آگیا اور میں نے آنکھیں لال کر کے کہا '' مہاراج سے کہو ہم نے آپ سے اور آپ کی رعایا سے بہت کچھ انعام لے لیا ہے۔ اب ہمیں اور سُکھ نہیں چاہیے اور دیکھو مہاراج سے جا کر کہہ دو کہ مائی نانکی پاکستان ضرور جائے گی کیونکہ اگر پاکستان نہیں جائے تو کیا جہنم میں جائے گی۔ ''

سپاہی یہ سُن کر واپس مہاراج کے پاس چلا گیا اور دوسرے ہی روز ملٹری کے ایک کرنل کی حفاظت میں مائی نانکی

سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو رہی تھی۔

سرحد پر اُسے پتہ چلا کہ اُس کے کنبے کے پچیس افراد میں سے اٹھارہ جن میں لڑکے اور لڑکیاں تھیں شہید ہو چکے ہیں اور باقی کے تین لڑکے اور ایک بہو اور دو بچے پاکستان صحیح و سلامت جا چکے ہیں۔ وہ کہتی تھی میرے آنسو نہیں نکلے۔ میں نے اپنا بھرا بھرایا گھر دیا سات گائیں بھینسیں اور تیس ہزار کا زیور کشمیر کے ہندوؤں اور عیسائیوں نے چھین لیا۔

میرے اٹھارہ لاڈلے جن میں بڑے بڑے سورما تھے ان کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ میں خود اُجڑی لیکن میرے آنسو نہیں نکلے۔ ہاں زندگی میں پہلی بار روئی وہ اس وقت جب میں نے مہاجرین کے کیمپ میں پاکستانیوں کو جوان لڑکیوں سے بدفعلی کرتے دیکھا اپنی بہو اور لڑکوں سمیت شہر بہ شہر پیٹ پالنے کی خاطر پھرتی رہی۔ آخر اپنے ایک عزیز کے ہاں جو کہ خوش قسمتی سے حویلی دھیان سنگھ میں رہتا تھا آگئی اور اس کے لڑکے موچی گری کرنے لگے اُس کے متعلق وہ کچھ پہلے بھی جانتے تھے۔

جموں کی ٹھاٹ دار زندگی اور اس کے تمام حالات وہیں رہ گئے۔ لیکن جہاں تک میں نے اُسے یہاں جس غربت کی حالت میں دیکھا ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی اونچے درجے کی عورت ہے۔ ایسی عورتیں بہت کم دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔ اُس کی ذات بہت ہی بلند اور بے مثال ہے۔ ۸۵ سال کی عمر ہونے کو آئی لیکن گھر کا سب کام کاج خود کرتی ہے۔ بیماری اور پریشانی میں بھی اس کا چہرہ پُر وقار اور پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے غمگین نہیں ہوتی اور نہ کسی گہری سوچ میں غرق رہتی ہے۔ چوبیس گھنٹے ہنستی اور مسکراتی رہتی ہے۔

اس بڑھاپے میں بھی بڑی بڑی بوجھل چیزیں خود اُٹھاتی ہے۔ بڑی اچھی باتیں سُناتی ہے۔ کسی بھی فقیر کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ اور سب سے بڑی بات جو میں اب اُس کے متعلق بتانے لگا ہوں وہ یہ کہ وہ انتہا درجے کی غریب عورت ہوتے ہوئے بھی بڑے بڑے شہنشاہوں سے زیادہ امیر ہے۔ اس لیے کہ اس کا دل بادشاہ کا ہے۔ اگر محلے کی کسی عورت نے اس سے کچھ مانگ لیا تو بس بھر بھر کے دیتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ خوش ہوتی جاتی ہے اور مجھے تو بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا شہنشاہ اپنی رعیت کو کائنات کی نعمتیں تقسیم کر رہا ہو۔ کھانے کے معاملے میں وہ بہت تیز ہے اور اس عمر میں بھی دن میں وہ چار وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سارا سر سفید ہوگیا ہے لیکن اُس کے گالوں پر سُرخیاں ہنوز باقی ہیں۔

اس کا اپنا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ کسی زچہ کو دیکھنے گئی تو اتفاق سے وہاں گھر والوں نے گھی، سوجی پستے بادام اور

دوسرے میوے ملا کر ایک قسم کی چوری تیار کی تھی جو کہ تین چار سیر کے قریب ہوگی۔ شامت اعمال لڑکی کی ماں نانکی کو ذرا چکھ کے دیکھنے کو کہہ بیٹھی۔ بس اس کا کہنا تھا کہ نانکی نے برتن تھام لیا اور ساری چوری چٹ کر گئی۔ اتنا کچھ کھا چکنے کے بعد وہ کہتی تھی مجھے کچھ خبر بھی نہ ہوئی اور وہ وہاں سے اُٹھ کر دوسری زچہ کے ہاں گئی جہاں سے اس نے ایک سیر کے قریب حلوہ پوری کھایا اُسی طرح کے کئی اور واقعات وہ ہنس ہنس کے سُناتی ہے۔ جہاں تک لباس کا تعلق ہے وہ عام پنجابی لباس یعنی قمیص اور شلوار پہنتی ہے لیکن اس عام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی قمیص کو ہمیشہ شلوار کے اندر کر کے ازاربند باندھتی ہے۔ میں نے اُس سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگی۔ ''تم ابھی بچے ہو۔ تمھیں کیا معلوم ہو۔'' اور میں خاموش ہوگیا۔ پاؤں میں وہ مردانہ جوتا پہنتی ہے اور جب آدھی رات کو سب سوئے ہوتے ہیں اور وہ غسل خانے میں جاتی ہے تو اُس کے پاؤں کی آواز بہت ہی مہیب معلوم ہوتی ہے۔ اب ذرا سا اُس کے لڑکوں کے متعلق سُن لیجیے۔ اُس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام حبیب اللہ ہے جس کی ایک دکان جوتیوں کی ہے اور نانکی کا کہنا ہے کہ اُس لڑکے کو اس نے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا ہے اور وہی سب میں زیادہ خدمت گزار اور وفا شعار ہے وہ اُس کی خوب خدمت کرتا ہے اور نانکی اس پر بہت خوش ہے۔ حبیب اللہ اپنی سسرال کے مکان کی سب سے اوپر والی منزل کے دو کمروں میں ایک بیوی اور تین بچوں سمیت رہتا ہے۔ گرمیوں میں اُس کے بچوں کے پاؤں دھوپ میں جل جل جاتے ہیں اور سردیوں میں اوپر سکڑتے رہتے ہیں لیکن آج تک کبھی اس نے ماتھے پر بل نہیں ڈالا اور نہ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بے خبر ہوئے ہیں بلکہ وہ اپنے دستور کے مطابق ہر اتوار کو نانکی کے لیے پانچ سات روپے کا پھل وغیرہ لے کر مسکراتا ہوا آتا ہے اور نانکی کی دُعائیں لے کر چلا جاتا ہے۔

اس سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد حسین ہے جو بجلی اور ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہے اور اُسے دفتر روزگار سے کم از کم پانچ دفعہ کارڈ بنوانے کے باوجود آج سات سال سے کوئی نوکری نہیں ملی۔ مائی نانکی نے بڑی کوشش کی کہ جیتے جی اپنے ان پالے ہوئے لڑکوں کی شادیاں کر کے جائے تاکہ بعد میں وہ دربدر نہ ہوں اور اسے بھی قبر میں آرام نصیب ہو۔ لیکن بقول اُسی کے، غریب کو مر کے بھی آرام نہیں ملتا۔ شاید اسی لیے ابھی تک اُس کی شادی کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔

ایک دو جگہ دریافت کرنے پر لڑکی والوں نے کہا کہ کم از کم دو تین زیور لڑکی کو ڈالو تب لڑکی ملے گی ورنہ نہیں لیکن دوسری طرف یعنی نانکی کے پاس تو صرف اللہ کا نام اور اپنا بیٹا ہی ہے۔ نانکی کا کہنا ہے کہ اس کا لڑکا محمد حسین

س کے خاظ سے تو سی بڑے لیدرے برابر ہے یعنی اس کی ا گر ہندے لات کی طرح ہے۔

محمد حسین سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد یونس ہے جو خوبصورت اور دُبلا پتلا ہے اور اُس کی تعلیم سات جماعت تک ہے۔ سینکڑوں کام کرنے کی تجویزیں کر رہا ہے اور جن میں سب سے بڑی خواہش اُس کی یہ ہے کہ اُسے کوئی معمولی سی ملازمت مل جائے جہاں اسے صبح سے دوپہر تک کام کرنا پڑے اور شام کے وقت وہ کچھ پڑھ لے اور اس طرح اپنی تعلیم کو بڑھا سکے۔ لیکن آج تک اُس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ نانکی کا یہ خیال ہے کہ وہ جنات کی قوم سے ہے کیونکہ اُس میں غصے کا مادہ زیادہ ہے۔ مائی نانکی آج کل کچھ اداس اور غمگین سی رہنے لگی ہے ایک روز میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی ''بچے مجھے پاکستان نے بہت سی بیماریاں لگا دی ہیں۔ مجھے جموں میں کوئی بیماری نہیں تھی اور نہ کبھی میں نے کسی بات کے متعلق آج تک سوچا ہے۔ ہاں اپنی ساری زندگی میں ایک دفعہ میں نے ایک بات پر غور کیا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے اصل میں قصہ یہ ہوا کہ جموں کی ایک باہمنی کے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا بڑی بڑی کاریگر نرسوں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور مصیبت یہ تھی کہ بچہ پیٹ میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا تھا اور ہمکتا بھی تھا۔ اس مشکل میں سبھی نے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ نانکی کو بُلاؤ۔ چنانچہ میں گئی اور دو ہاتھ لگانے سے ہی بچہ پیدا ہوگیا لیکن میرا رنگ اُڑ گیا اور اپنی جوانی میں میں پہلی بار سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہوگئی۔ ''یہاں تک کہہ کر وہ ذرا رکی۔

میں نے پوچھا ''کیوں؟'' کہنے لگی ''کیونکہ بچے کے دو سر چار آنکھیں اور دونوں سروں میں دو دو سینگ تھے۔ میں نے آنکھیں لال کرتے ہوئے براہمن سے کہا ''کیوں لالہ یہ کیا ظلم کیا تم نے۔ تم نے مجھے بتایا تک نہیں کہ یہ قصہ ہے۔ اگر میرے دل کی حرکت بند ہو جاتی تو؟''

اس پر لالہ جی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کہ کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ جو جی چاہے لے لو۔ سو میں نے اُس سے سو روپے لیے۔ لیکن اب تو کئی اندیشے جان کو کھائے جا رہے ہیں بچہ سب سے زیادہ اس بات کو سوچتی ہوں کہ میں پاکستان کی خاطر اپنا بھرا بھرایا گھر لُٹا کر آئی۔ اٹھارہ آدمی شہید ہوئے اور تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی وہیں رہ گیا۔ اس بے بسی اور غربت کی حالت میں ہم یہاں آئے۔ لیکن پاکستان والوں نے میرے نام کوئی مکان الاٹ کیا اور نہ کوئی دُکان۔ آج تک نہ کہیں سے راشن ملا اور نہ ہی کچھ مالی امداد۔ باغ کا مالی جس نے پاکستان کو بڑی مشکلوں سے بنایا تھا اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اب اُس کے بعد جتنے بھی ہیں آنکھیں بند کیے مست پڑے ہیں۔ اُن کو کیا خبر کہ ہم غریب کس حالت میں رہ رہے ہیں اس کی خبر یا ہمارے اللہ کو ہے یا ہمیں۔ اس لیے اب ہر دم اپنے اللہ سے یہی دُعا کرتی ہوں کہ ایک دفعہ پھر سے سب کو مہاجر کرتا کہ غیر مہاجر لوگوں کو پتہ چلے کہ مہاجر کس طرح ہوتے ہیں اتنا کہہ

کر اُس نے حقے کی نے منہ میں دبا لی۔

میں نے اُس سے کہا۔ ''مائی پہلے تو لوگ ہندوستان سے مہاجر ہوئے تو پاکستان آ گئے۔ اب اگر یہاں سے مہاجر ہو گئے تو کہاں جائیں گے''۔

وہ حقے کی نے کو غصے سے جھٹک کر بولی ''جہنم میں جائیں گے۔ کوئی پروا نہیں۔ لیکن ان کو معلوم تو ہو جائے گا کہ مہاجر کس کو کہتے ہیں۔''

سعادت حسن منٹو

۲ نومبر ۱۹۵۴ء

شريفن

جب قاسم نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ تو اسے صرف ایک گولی کی جلن تھی جو اس کی دہنی پنڈلی میں گڑ گئی تھی۔ لیکن اندر داخل ہو کر جب اس نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ قریب تھا کہ وہ لکڑیاں پھاڑنے والے گنڈاسے کو اٹھا کر دیوانہ وار نکل جائے اور قتل و گری کا بازار گرم کر دے کہ دفعتہً اسے اپنی لڑکی شریفن کا خیال آیا۔

''شریفن، شریفن''۔ اس نے بلند آواز میں پکارنا شروع کیا۔

سامنے دالان کے دونوں دروازے بند تھے۔ قاسم نے سوچا۔ شاید ڈر کے مارے اندر چھپ گئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس طرف بڑھا اور درز کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔ ''شریفن، شریفن۔۔۔۔۔۔ میں ہوں تمہارا باپ۔'' مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ قاسم نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ کو دھکا دیا۔ پَٹ کھلے اور وہ اوندھے منہ دالان میں گر پڑا۔ سنبھل کر جب اس نے اٹھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی۔۔۔۔۔۔ قاسم چیخ کیساتھ بیٹھا۔

ایک گز کے فاصلے پر ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ ننگی۔۔۔ بالکل ننگی گورا گورا سڈول جسم، چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پستان۔۔۔ ایک دم قاسم کا سارا وجود ہل گیا۔ اس کی گہرائیوں سے ایک فلک شگاف چیخ اٹھی۔ لیکن اس کے ہونٹ اس قدر زور سے بھینچے ہوئے تھے کہ باہر نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوگئی تھیں۔ پھر بھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ مردہ سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔ ''شریفن۔'' اور اس نے آنکھیں بند کیے دالان میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر کچھ کپڑے اٹھائے اور انھیں شریفن کی لاش پر گرا کر وہ یہ دیکھے بغیر ہی باہر نکل گیا کہ وہ اس سے کچھ دور گرے تھے۔

باہر نکل کر اس نے اپنی بیوی کی لاش نہ دیکھی۔ بہت ممکن ہے اسے نظر ہی نہ آئی ہو۔ اس لیے کہ اس کی آنکھیں شریفن کی ننگی لاش سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کونے میں پڑا ہوا لکڑیاں پھاڑنے والا گنڈاسا اٹھایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

قاسم کی دہنی پنڈلی میں گولی گڑی ہوئی تھی۔ اس کا احساس گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے دل و دماغ سے محو ہوگیا تھا۔ اس کی وفادار پیاری بیوی ہلاک ہو چکی تھی۔ اس کا صدمہ بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی تصویر آتی تھی۔۔۔ شریفن کی۔۔۔ ننگی شریفن کی۔۔۔۔۔۔ اور وہ نیزے کی انی بن بن کر اس کی آنکھوں کو چھیدتی ہوئی اس کی روح میں بھی شگاف ڈال دیتی۔

گنڈاسا ہاتھ میں لیے قاسم سنسان بازاروں میں ابلتے ہوئے لاوے کی طرح بہتا چلا جارہا تھا۔ چوک کے پاس اس کی

مڈبھیڑ ایک سکھ سے ہوئی۔ بڑا لڑیل جوان تھا۔ لیکن قاسم نے کچھ ایسے بل تلے پن سے حملہ لیا اور ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ تیز طوفان میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آرہا۔

قاسم کی رگوں میں اس کا خون اور زیادہ گرم ہوگیا۔ اور بجنے لگا۔ تڑتڑتڑتڑ۔۔۔ جیسے جوش کھاتے ہوئے تیل پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا پڑجائے۔

دور سڑک کے اس پار اسے چند آدمی نظر آئے۔ تیر کی طرح وہ ان کی طرف بڑھا اسے دیکھ کر ان لوگوں نے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے لگائے۔ قاسم نے جواب میں اپنا نعرہ لگانے کے بجائے انھیں ماں باپ کی موٹی موٹی گالیاں دیں اور گنڈاسا تانے ان میں گھس گیا۔

چند منٹوں ہی کے اندر تین لاشیں سڑک پر تڑپ رہی تھیں۔ دوسرے بھاگ گئے لیکن قاسم کا گنڈاسا دیر تک ہوا میں چلتا رہا۔ اصل میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گنڈاسا گھماتے گھماتے وہ ایک لاش کے ساتھ ٹکرایا اور گرپڑا۔ اس نے سوچا کہ شاید اسے گرالیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گندی گندی گالیاں دے کر چلانا شروع کیا۔ "مار ڈالو مجھے، مار ڈالو مجھے۔"

لیکن جب کوئی ہاتھ اسے گردن پر محسوس نہ ہوا اور کوئی ضرب اس کے بدن پر نہ پڑی تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ سڑک پر تین لاشوں اور اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک لحظے کے لیے قاسم کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ شاید وہ مرجانا چاہتا تھا لیکن ایک دم شریفن۔۔۔ ننگی شریفن کی تصویر اس کی آنکھوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئی اور اس کے سارے وجود کو بارود کا جلتا ہوا فلیتہ بنا گئی۔۔۔۔۔ وہ فوراً اٹھا۔ ہاتھ میں گنڈاسا لیا اور پھر کھولتے ہولے لاوے کی طرح سڑک پر بہنے لگا۔

جتنے بازار قاسم نے طے کیے سب خالی تھے۔ ایک گلی میں وہ داخل ہوا۔ لیکن اس میں سب مسلمان تھے۔ اس کو بہت کوفت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے لاوے کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ ایک بازار میں پہنچ کر اس نے اپنا گنڈاسا اونچا ہوا میں لہرایا اور ماں بہن کی گالیاں اگلنا شروع کیں۔

لیکن ایک دن اسے بہت ہی تکلیف دہ احساس ہوا کہ اب تک وہ صرف ماں بہن کی گالیاں ہی دیتا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً بیٹی کی گالی دینا شروع کی اور ایسی جتنی گالیاں اسے یاد تھیں سب کی سب ایک ہی سانس میں باہر لاٹ دیں۔۔۔ پھر بھی اس کی تشفی نہ ہوئی۔ جھنجھلا کر وہ ایک مکان کی طرف بڑھا۔ جس کے دروازے کے اوپر ہندی میں کچھ لکھا تھا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ قاسم نے دیوانہ وار گنڈاسا چلانا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں کواٹر ریزہ ریزہ ہوگئے۔

قاسم اندر داخل ہوا۔

چھوٹا سا گھر تھا۔ قاسم نے اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر پھر گالیاں دینا شروع کیں۔ ''باہر نکلو۔۔۔۔۔۔ باہر نکلو۔''

سامنے دالان کے دروازے میں چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ قاسم اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر گالیاں دیتا رہا۔

دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی نمودار ہوئی۔

قاسم کے ہونٹ بھینچ گئے۔ گرج کر اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔ ''ہندو۔''

قاسم تن کر کھڑا ہوگیا۔ شعلہ بار آنکھوں سے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جس کی عمر چودہ یا پندرہ برس کی تھی اور ہاتھ سے گنڈاسا گرادیا۔ پھر وہ عقاب کی طرح جھپٹا اور اس لڑکی کو دھکیل کر اندر دالان میں لے گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے دیوانہ وار کپڑے نوچنے شروع کیے۔ دھجیاں اور چندیاں یوں اڑنے لگیں جیسے کوئی روئی دھنک رہا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ قاسم اپنا انتقام لینے میں مصروف رہا۔ لڑکی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس لیے کہ وہ فرش پر گرتے ہی بیہوش ہوگئی تھی۔

جب قاسم نے آنکھیں کھولیں تو اس کے دونوں ہاتھ لڑکی کی گردن میں دھنسے ہوئے تھے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ انھیں علیحدہ کرکے وہ اٹھا پسینے میں غرق اس نے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا تاکہ اس کی اور تشفی ہوسکے۔

ایک گز کے فاصلے پر اس جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔۔۔ ننگی۔۔۔ بالکل ننگی۔ گورا گورا سڈول جسم چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوٹے پستان۔۔۔۔۔۔ قاسم کی آنکھیں ایک دم بند ہوگئیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ بدن پر گرم گرم پسینہ برف ہوگیا اور اس کی رگوں میں کھولتا ہوا لاوا پتھر کی طرح منجمد ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی تلوار سے مسلح مکان کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دالان میں کوئی شخص آنکھیں بند کیے لرزتے ہاتھوں سے فرش پر پڑی ہوئی چیز پر کمبل ڈال رہا ہے۔ اس نے گرج کر اس سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

قاسم چونکا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔

مسلح آدمی چلایا۔ ''قاسم!''

قاسم ایک بار پھر چونکا۔ اس نے اپنے سے کچھ دور کھڑے آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں نے اس

کی مدد نہ کی۔

مسلح آدمی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا کر رہے ہو تم یہاں؟''

قاسم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے فرش پر پڑے ہوئے کمبل کی طرف اشارہ کیا اور کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ''شریفن۔۔۔''

جلدی سے آگے بڑھ کر مسلح آدمی نے کمبل ہٹایا۔ ننگی لاش دیکھ کر پہلے وہ کانپا، پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ ''بملا بملا'' کہتا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔

قادر اقصائی

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی' یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی' بڑی دُور دُور سے رئیس اس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا' اسے محبت ہو گئی' اُس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی کوئی تین سو کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اُس کے پاس آتا، رات ٹھہرتا۔ صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں اُن کا یہ بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بیچارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دُھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اُس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقعہ مل ہی گیا' پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا:

''زہرہ جان ــــ میں غریب آدمی ہوں' مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں ــــ لیکن تمھیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے ــــ میں تم سے محبت کرتا ہوں ــــ معلوم نہیں کیوں''

زہرہ جان ہنسی' اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا ''تم ہنستی ہو ــــ میری محبت کا مذاق اُڑاتی ہو' اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کماتا ہے ــــ یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمھیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لیے موجود ہے''

زہرہ جان اُکتا گئی' اُس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو' لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔

ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی ــــ اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور' اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا' بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے ــــ کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

اِدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی' اُدھر عیدن جوان ہوتی گئی' اُس کی ماں نے اُس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی'

زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گئی' وہ اب اُس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے' وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی' ابھی تک اُس نے اُس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دُور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے' وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نتھنی اُتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے' مگر اُس کو اتنی جلدی نہیں تھی' وہ چاہتی تھی کہ مسّی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے ___ اس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی' سارے شہر میں اُس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اُس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی' عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔

پھنسی پھنسی چولی میں گدرایا ہوا جوبن' سڈول بانہیں' مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا لہو' ایسا رنگ' ٹھمکا سا قد' گھنگریالے بال ___ قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی اُمید بَر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسّی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا' کئی دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب صاحب اپنی بگھی میں آئے' زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ___ نواب صاحب بہت خوش ہوئے' عیدن دولہن بنی ہوئی تھی' نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا مجرا شروع ہوا ___ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو محوِ نغمہ سرائی تھا۔

عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی' اُس کی ہر جنبش' ہر ادا' اس کے گانے کی ہر سُر زہد شکن تھی۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا' وہ بہت گھبرائی' یہ وہی بڑھئی تھا ___ اُس کا عاشقِ راز' بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے' ابکائیاں آنے لگیں۔ انھوں نے زہرہ جان سے کہا: ''یہ کون بدتمیز ہے؟''

بڑھئی مسکرایا' ''حضور! میں ان کا عاشق ہوں''

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدّر ہو گئی ' زہرہ جان ' نکالو اس حیوان کو باہر ''

بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی ' نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے ' عیدن بیہوش ہو گئی ۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید ہو گئی تھی ۔

عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دو اڑھائی مہینے تک بیمار رہی ۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے ۔ ہسپتال میں اس کی تیمار داری صرف اُس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے ۔ وہ نواب اور رئیس جو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے ' بُھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے ــــ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی ۔

وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی ــــ مگر اس کی طبیعت اتنی اُداس تھی کہ اس کا جی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا ۔ اُس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے وہ انھیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی ۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں ' اس کو بڑا دُکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چُوڑی یا نکلس اونے پونے داموں بیچتی تھی ــــ عجب عالم تھا ' خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا ۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں ۔ عیدن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی میں نہیں رہے گی ۔ لاہور چلی آئے گی ۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بیچ کر وہ لاہور پہنچ گئی لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے ۔

جب وہ لاہور پہنچی تو وہ لُٹی پٹی تھی ــــ لیکن اس کا حسن ویسے کا ویسا تھا ۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اُس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی برتی ۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی ؟ اُس کے پاس تو چنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی ذہین تھی ' سیدھی اُس جگہ پہنچی جہاں ان کی ہم پیشہ رہتی تھیں ' یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی ۔

ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا ' ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے ' مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا ۔ ہیرا منڈی کے وارے نیارے تھے ۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہوگئے۔ رات بھر اس کو [illegible] لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اُس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا___ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرایے پر لے کر وہاں اُٹھ آئی، چونکہ جہاں وہ مقیم تھی، اس نائکہ کو اسے اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔

جب اُس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرا کرنا شروع کیا تو اُس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی، اس نے کئی زیور بنا لیے، کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرا لیے۔

اُسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا، اُس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے، خوبصورت تھا، اُس کے پاس تین کاریں تھیں، پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے اپنی کھڑی سفیدپیکارڈ اُس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو ڈھائی سو روپے اُس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی، اُس نے عیدن سے پوچھا ''کیا بات ہے آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے''

عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا ''آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے؟''

دوسرے دن اُس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیے، اُس کے تیسرے روز بعد اُس نے ڈھائی ہزار روپے دیے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا، جب وہ آگرے اور دلّی میں تھی تو اُسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا مگر لاہور میں اُسے قادرا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا___ بغیر ریشے کے، ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

''دُکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادرا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی، عیدن کے حوالے کر دیتا، اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا، عیدن کے عشق میں بہت بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا، اُس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد، منقولہ اور غیر منقولہ اُس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ اس سے شادی کر لے___ مگر عیدن نہ مانی، ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔

اُس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اُس کی ہو جائے مگر ہر بار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی، معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے ــــ یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سائیں ــــ کے تکیے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کرم کرو' میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ــــ تم اتنے ظالم کیوں ہو ــــ اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادرا قصائی ہے' اُسے دُھتکار رہا ہے۔ ''جا ــــ ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا ــــ مجھے تنگ نہ کیا کر'' قادرا اُسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اُسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

۲۴، مئی ۵۴ء

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے۔۔۔۔۔۔ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں۔ لوٹ، آگ۔۔۔۔۔۔ بھاگم بھاگ۔۔۔۔ اسٹیشن۔۔۔۔ گولیاں۔۔۔۔۔۔ رات اور سکینہ۔۔۔۔۔۔ سراج الدین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ ''سکینہ سکینہ'' پکارتا کیمپ میں خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتا نہ ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ اور گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا۔ جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا ''مجھے چھوڑو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا ''ابا جی۔۔۔۔۔۔ چھوڑیئے۔'' لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔۔۔۔۔۔ سکینہ کا وہی پٹہ تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن

تک لے آیا تھا؟۔۔۔۔۔۔ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟۔۔۔۔۔۔ راستہ میں جب گاڑی روکی لئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہوگیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا۔ مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔

چھ روز کے بعد جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے۔ جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا۔ "گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔۔۔۔۔۔ مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی۔۔۔۔۔۔ عمر سترہ برس کے قریب ہے۔۔۔۔۔۔ آنکھیں بڑی بڑی۔۔۔۔۔۔ بال سیاہ، دہنے گال پر موٹا سا تل۔۔۔۔۔۔ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ ڈھونڈ لاؤ۔ تمہارا خدا بھلا کرے گا۔"

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوان نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گزر گئے مگر انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھ ہرٹہ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ اری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کردیا۔ رضا کاروں نے موٹر رکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ دہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا "گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔۔ کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟"

لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہوگیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا۔ دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔ کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کررہی تھی۔ اور بار بار بانھوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

کئی روز گزر گئے ۔۔۔ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی ۔۔۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا

کئی دن گزر گئے۔۔۔۔۔۔ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا۔ لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا۔ جنہوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں ہی میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضا کاروں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔ ''بیٹا، میری سکینہ کا پتہ چلا؟''

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''چل جائے گا، چل جائے گا۔'' اور لاری چلا دی۔

سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑسی ہوئی۔ چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گئے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔ ''سکینہ!''

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا۔ ''جی میں۔۔۔۔۔۔ جی میں۔۔۔۔۔۔ اس کا باپ ہوں!''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا ''کھڑکی کھول دو۔''

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا۔ ''زندہ ہے۔۔۔۔۔۔ میری بیٹی زندہ ہے''۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ۔۔۔۔۔۔ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔۔۔۔۔۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی مکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کردیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، ترو تازگی چوس کر خوش ہورہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کررہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہوگیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان۔۔۔۔۔۔ محلے میں تھا۔ جو کٹڑ مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہوگیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔۔۔۔۔۔ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا۔۔۔۔۔۔ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ۔۔۔۔۔۔ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیو لالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی وتندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کردیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ نرنجن، یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہاں سے اٹھ جاؤ، اور میرے

یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارا کرلیا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرادیا۔ ''تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئے ہے۔ بمبئے۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ بارہ برس سے۔''

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔

اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس چھومنتر ہے۔۔۔۔۔۔ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔۔ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا۔۔۔۔۔۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو وہ بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کررہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔

اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سِکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔۔۔۔۔۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا، شاید اس لیے کہ

وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔۔۔۔۔۔ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو، گوڈے گوڈے عشق ہوگیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے اے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لباس سفید چغہ پہنے تھے۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ بانھیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔۔۔۔۔۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔۔۔۔۔۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آرہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔۔۔۔۔۔ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور۔۔۔۔۔۔جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ

بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل۔۔۔۔۔۔ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں سے اس معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ ''یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔'' اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوڑی ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانھوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوتی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں ''گوڈے گوڈے'' دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کردیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لیے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آگیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہوسکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی۔ ''تم سکھ ہو۔۔۔۔۔۔یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔''

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا۔ ''کون سی نازک باتیں۔۔۔۔۔۔تمہارے پرانے یاروں کی؟''

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کردیتی اور کہتی۔ ''یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔۔۔۔۔۔ ہاں وہ میرے یار ہیں۔۔۔۔۔۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔''

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا۔ '' اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی''

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ ''تم سچ مچ سِکھ ہو۔۔۔۔۔۔ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ۔۔۔۔۔۔ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کرلو۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔''

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا رد عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔۔۔۔۔۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ ''گوڈے گوڈے'' اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کرپوچھا۔ ''موذیل۔۔۔۔۔۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔''

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔ ''میں سکھ سے محبت نہیں کرسکتی۔''

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔۔۔۔۔۔ ''موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔۔۔۔۔۔ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔''

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ ''تم شیوا کرالو اور اپنے سر

ے بال سے خوشبودار ہو۔۔۔۔۔۔۔ تو میں شرط لگاتی ہوں کہ تو بندے کہیں آنکھ ماریں گے۔۔۔۔۔۔۔ تم تو خوبصورت ہو۔''

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑگئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کردیے۔

موذیل نے ایک دم ''پھوں پھوں'' کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہوگئی۔

''میں صبح اپنے دانتوں پر برش کرچکی ہوں۔۔۔۔۔۔ تم تکلیف نہ کرو۔''

ترلوچن چلایا۔ ''موذیل۔''

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔ ''خدا کی قسم۔۔۔۔۔۔ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کرسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی۔''

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کردی۔۔۔۔۔۔ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کرکے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کردے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کررہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔ ''تمہارے بال بہت ملائم ہیں۔۔۔۔۔۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہوسکے گا۔۔۔۔۔۔ ترلوچن۔۔۔۔۔۔ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔''

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے آج تک

تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔۔۔۔۔۔ تم لیوں اڑاتی ہو۔۔۔۔۔۔ دیکھو کسی لے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔۔۔۔۔۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں۔''

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کردیا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

''پھر۔'' ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں۔۔۔۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کرچکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔''

ترلوچن اچھل پڑا۔ ''سچ''

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔ ''ہاں!''

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ ''تو۔۔۔۔۔۔ تو کب؟''

موذیل الگ ہٹ گئی۔ ''جب۔۔۔۔۔۔ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!''

ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ ''میں کل ہی کٹوا دوں گا۔''

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ ''تم بکواس کرتے ہوئے ترلوچن۔۔۔۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ ''تم دیکھ لوگی۔''

''دیکھ لوں گی۔'' اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور ''پھوں پھوں'' کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا۔۔۔۔۔۔ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہوگیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہوجاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کردیا۔ جہاں ٹینکوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر کے دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر ''مائی ڈارلنگ ترلوچن'' کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کردیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔۔۔۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کردیا۔۔۔۔۔۔

ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔ ''نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔''

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ ''مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ ایسے ہی چلتا ہے۔''

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آگیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہوگئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا۔ ''شادی کل ہوگی!''

''ضرور۔'' موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔۔۔۔۔۔ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔

دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چل گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟۔۔۔۔۔۔ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بُھول گیا۔۔۔۔۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔۔وہ بے حیا تھی۔۔۔۔۔۔بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیو لالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔

وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔ ''تم سکھ ہو۔۔۔۔۔۔مجھے تم سے نفرت ہے!''۔۔۔۔۔۔

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دوٹوک فیصلہ کردیتی۔ انڈر ویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا وہ چڑ جاتی تھی۔ ''یہ حیا ویا کیا بکواس ہے۔۔۔۔۔۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔۔۔۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔۔۔۔۔۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔۔۔۔۔۔ تم سکھ ہو۔۔۔۔۔۔مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلکی سا انڈر ویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔۔۔۔۔۔یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح مذہب میں شامل ہے۔۔۔۔۔۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈر ویئر میں چھپا بیٹھا ہے!''

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرادیا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کردیا۔۔۔۔۔۔ کرپا کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی۔ جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی، وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔۔۔۔۔۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کرسکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہوگئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چ اہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔۔۔۔۔۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔۔۔ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔۔۔۔۔۔ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا۔ ''یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودا ہو گئی۔۔۔۔۔۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟''۔۔۔۔۔۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی۔۔۔۔۔۔ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔۔۔۔۔۔ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رد عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی۔ ''تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟''

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ ''اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوبلو سکرٹ صاف کر سکے۔۔۔۔۔۔۔مگر وہ تو وہیں دیو لالی میں رہ گئی ہے۔''

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ ''بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟''

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔۔۔۔۔۔کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔

ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ ''بیمار رہی ہو؟''

''نہیں۔'' موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

''پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟''

''میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔'' موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ ''تم گویا کہ۔۔۔۔۔۔اب پھر۔۔۔۔۔۔۔۔نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔''

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ ''ہاں!''

''مبارک ہو۔'' موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔ ''کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟''

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں!''

''مبارک ہو۔۔۔۔۔۔۔اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟''

''نہیں۔''

''یہ بہت بری بات ہے۔'' موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ ''ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔''

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔ ''کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟''

''نہیں۔''

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس

نے ''نہیں'' کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کردیے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ ''تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کرلوں گی۔''

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کررہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔۔۔۔۔۔ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔ ''موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ ''وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟۔۔۔۔۔۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟''

''اس کو ابھی تک معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔ داڑھی میں نے تمہارے دیو لالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کردی تھی۔۔۔۔۔۔ محض انتقامی طور پر۔۔۔۔۔۔ اسے کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے'' ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔ ''یہ بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے۔۔۔۔۔۔ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے۔''

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ ''کب ہورہی ہے تمہاری شادی؟''

''ابھی کچھ پتہ نہیں۔'' یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہوگیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ ''ترلوچن۔۔۔۔۔۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟''

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ ''تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔۔۔۔جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟''

''مشکل!۔۔۔۔۔۔ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔۔۔۔ کسی بھی معاملے کی نزاکت۔۔۔۔۔۔ تم ایک لا ابالی قسم کی لڑکی ہو۔۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔''

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ ''افسوس بی ڈیمڈ۔۔۔۔۔۔ سلی ایڈیٹ۔۔۔۔۔۔ تم یہ سوچو کہ تمہاری اُس۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے۔۔۔۔۔۔ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے۔۔۔۔۔۔ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔۔۔۔ تم ایک سِلی قسم کے آدمی ہو۔۔۔۔۔۔ اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نڈر مرد چاہیے۔۔۔۔۔۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔۔۔چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!''

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔۔۔۔۔۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ ''کہاں سے؟''

''وہیں سے، جہاں وہ ہے۔۔۔۔۔۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔''

''مگر سنو تو۔۔۔۔۔۔ کرفیو ہے۔''

''موذیل کے لیے نہیں۔۔۔۔۔۔ چلو آؤ۔''

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرح کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

موذیل نے کہا۔ ''یہ تمہاری داڑھی۔۔۔۔۔۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔''

''ننگے سر!'' ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ ''میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔''

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔ ''کیوں؟''

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ ''تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔''

''کیوں ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔''

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ ''تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔۔۔۔ گدھے کہیں کے۔۔۔۔۔۔ اس کی جان کا سوال ہے۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔''

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔''

موذیل چڑ گئی۔ ''اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ۔۔۔۔۔۔ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہارے طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس کی جان کو خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔۔۔۔۔۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔''

ترلوچن نے کہا۔ ''وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔''

''بہت اچھا کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔۔۔۔۔۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے۔''

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔۔۔۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!''

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاپ کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ ''گدھے۔۔۔۔۔۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے۔۔۔۔۔۔ تمہاری وہ۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس بھڑوی کا۔۔۔۔۔۔ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔۔۔۔۔۔ تم سکھ۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!''

ترلوچن بھنا گا۔ ''بکواس نہ کرو!''

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ ''ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی۔۔۔۔۔۔ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ تم کپڑے نہیں پہنو گی!

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ''نہیں۔۔۔۔۔۔چلے گا اسی طرح۔''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کرکے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ ''تم بہت ذلیل ہو۔''

موذیل مسکرائی۔ ''یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔۔۔۔۔۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔'' پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ ''یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں''

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہوجاتی تھیں اور لوگوں کی آمدورفت بھی جاری ہوجاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔''

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کررہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کے دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جارہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کررہا ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ ''اے۔۔۔۔۔۔کدھر جارہا ہے۔''

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر

کہا۔ ''اوہ، تم۔۔۔۔۔۔ ہم کو پچانا نہیں تم نے۔۔۔۔۔۔ موذیل۔۔۔۔۔۔'' پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر اس باجو۔۔۔۔۔۔ ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر لے کر جارہا ہے۔۔۔۔۔۔''

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا۔ ''لوپیو۔''

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا ''ہیر از لائٹ!''

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔۔۔۔۔۔ جس میں سے گزر کر انھیں۔۔۔۔۔۔ محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کررہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کرکے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کررہی ہے۔۔۔۔۔۔ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم سیپوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اسے کہا۔ ''ترلوچن ڈیئر۔۔۔۔۔۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔۔۔۔۔۔ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔۔۔۔۔۔ سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔''

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کرکے دوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی۔۔۔۔۔۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جارہی تھی۔ ایک لحظے کے لیے اس نے معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ چلو آؤ۔''

دونوں چلنے لگے۔۔۔۔۔۔ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔۔۔۔۔۔ کہ موذیل آگئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس کو آدمی

کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ '' اسے کیا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔اپنے بھائی کو مارتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔'' پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''کریم۔۔۔۔۔۔اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔''

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔ ''عیش کر سالی۔۔۔۔۔۔عیش کر'' پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ ''کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!''

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔۔۔۔سب چلتا ہے۔۔۔۔۔۔آؤ۔''

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔۔۔۔۔۔ترلوچن نے بھی قدم تیز کردیے۔

یہ گلی طے کرکے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔ ''کس گلی میں جانا ہے؟''

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ''تیسری گلی میں۔۔۔۔۔۔نکڑ والی بلڈنگ!''

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کردیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔۔۔۔۔۔ایک آدمی بڑے سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ ''موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ''ترلوچن ڈیئر۔۔۔۔۔۔یہ پگڑی اتار دو!''

ترلوچن نے جواب دیا۔ ''میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!''

موذیل جھنجھلا گئی۔ ''تمہاری مرضی۔۔۔۔۔۔لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے''

سامنے جو کچھ ہورہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔۔۔۔۔صاف گڑبڑ ہورہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہوگئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔ ''دیکھو، ایسا کرو۔۔۔۔۔۔میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔۔۔۔۔۔تم میرے پیچھے آنا۔۔۔۔۔۔بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کررہے ہو۔۔۔۔۔۔سمجھے۔۔۔۔۔۔مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔''

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔

ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔۔۔۔۔۔ سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ ''کون سا مالا؟''

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''دوسرا۔''

''چلو۔''

یہ کہہ وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہولیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہورہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی۔

''مہنگا سنگھ جی۔۔۔۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!''

اندر سے مہین آواز آئی۔ ''کون؟''

''ترلوچن!''

دروازہ دھیرے سے کھلا۔۔۔۔۔۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔۔۔۔۔۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔۔۔۔۔۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں بتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہوگیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ ''ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔''

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہوگئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ '' سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی۔۔۔۔۔۔ لیکن جلدی کرو۔''

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہورہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ ''اسے پکڑ لیا انھوں نے!''

ترلوچن نے پوچھا۔ ''کیسے؟''

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ ''پکڑ لیا تو اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔تم یہ کپڑے اتارو۔''

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آنا فانا اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانھوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہوگئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی۔ ''جاؤ، اسے لے جاؤ۔۔۔۔۔۔لیکن ٹھہرو۔''

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے کہا۔ ''جاؤ۔۔۔۔۔۔جلدی نکل جاؤ۔''

ترلوچن نے اس سے کہا۔ ''آؤ۔'' مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانھوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

''تم جاتے کیوں نہیں ہو؟'' موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔''

''جہنم میں جائیں وہ۔۔۔۔۔۔تم اسے لے جاؤ۔''

''اور تم؟''

''میں آجاؤں گی۔''

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کردیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔ ''سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔۔۔۔۔۔میں دروازہ کھولتی ہوں۔۔۔۔۔۔''

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ ''دروازہ۔''

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ ''میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔۔۔۔۔۔تم میرے پیچھے بھاگنا۔۔۔۔۔۔میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔۔۔۔۔۔تم بھی اوپر چلے آنا۔۔۔۔۔۔یہ جو لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول

جائیں لے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں لے۔۔۔۔۔۔''

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ ''پھر؟''

موذیل نے کہا۔ ''یہ تمہاری۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔ موقعہ پا کر نکل جائے۔۔۔۔۔۔ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔''

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔۔۔۔۔۔ سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اسکے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔۔۔۔۔۔ وہ جو لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا۔۔۔۔۔۔ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آرہی۔۔۔۔۔۔ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستہ بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہوگئے۔۔۔۔۔۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوحن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔ ''موذیل۔۔۔۔۔۔ موذیل۔''

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہورہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ، دیکھو۔۔۔۔۔۔ میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ۔۔۔۔۔۔''

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔ ''تم سچ مچ سکھ ہو۔۔۔۔۔۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔''

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا ''یہ میاں بھائی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن بہت دادا قسم کا۔۔۔۔۔۔ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔''

ترلوچن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔۔۔۔۔۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔۔۔۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا ''اوہ ڈیم اٹ۔۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''آل رائٹ ڈارلنگ۔۔۔۔۔۔ بائی بائی۔''

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ ''لے جاؤ اس کو۔۔۔۔۔۔ اپنے اس مذہب کو۔'' اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

سہائے

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔۔۔۔۔۔۔یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کرکے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہوگیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔۔۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جاسکتے ہیں۔۔۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔۔۔یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔۔۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟''

ممتاز اس روز بہت ہی پرجوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ ایک غیر متعین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جارہا تھا۔۔۔۔۔۔ پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہورہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اسکا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔''

ممتاز نے اس سے پوچھا۔ ''کیا کرو گے؟''

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔''

''یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہوگیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جارہا ہے۔''

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے۔ ''میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے، میں تمہیں مار ڈالوں'' غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔۔۔ ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا۔۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہوگیا تھا۔۔۔۔۔۔ خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

ن لگتے ہی اس نے پینا شروع کردی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے جارہا ہے۔۔۔۔۔۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابلِ بیان مسرت محسوس کررہا ہے، لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کیلیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کررہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں۔ اشارۃً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہوگیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کیے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا۔ ''یاد ہے برج۔۔۔ آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔''

راستے میں ممتاز خاموش رہا۔ مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر، لیکن وہ کچھ ایسی پرخلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہوگیا، لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہوگئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہتیں۔ حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزارہا ریفیوجی جارہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ۔۔۔۔۔۔ بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جارہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جارہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔۔۔۔۔۔ ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ محض فریبِ نظر ہے۔۔۔۔۔۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔۔۔ لیکن یہ فریبِ نظر کس قدر دلکش ہے۔۔۔۔۔۔ یہ ملاپ!''

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔''

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی، کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے

جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہورہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا۔ ''مجھے معاف کردینا ممتاز۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔''

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا۔ ''جب تم نے کہا تھا میں سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مارڈالوں۔۔۔۔۔۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔۔۔۔۔۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔''

جگل نے اثبات میں سرہلایا ''۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے افسوس ہےچ''

''تم مجھے مارڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔'' ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔۔۔۔۔۔ ایک مسلمان کو۔۔۔۔۔۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مارڈالا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہوجاتا۔ لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہوجاتا۔''

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''ہوسکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کردیتا۔ مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔۔۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مارڈالا۔۔۔۔۔۔ تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کردیا۔۔۔۔۔۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔۔۔۔۔۔ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔۔۔۔۔۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔۔۔۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔۔۔۔۔۔''

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت جذباتی ہوگیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت۔۔۔۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے۔ جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ میں نے اس سے کہا ''تم بالکل

ٹھیک کہتے ہو۔''

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا۔ ''نہیں بالکل ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے۔ لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔۔۔۔۔۔ مذہب سے میری مراد، یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں ہم میں سے ننانوے فی صدی بتلا ہیں۔۔۔۔۔۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟۔۔۔ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا'' یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا'' لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی؟۔۔۔ کٹر ہندو تھا۔۔۔پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟''

میں نے پوچھا۔ ''کس کی؟''

''ایک بھڑوے کی۔''

ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، اس لیے میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ '' ایک بھڑوے کی؟''

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرفِ عام میں ایک بھڑوا تھا۔۔۔۔۔۔ عورتوں کا دلال۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔''

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا'' اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔۔۔ کچھ سہائے تھا۔۔۔بنارس کا رہنے والا۔ بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔ پردے کا معقول انتظام تھا۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے۔ لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام۔۔۔ اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔۔۔ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجیے۔۔۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔۔۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے۔۔۔۔۔۔ [illegible] ڈھائی کمیشن [illegible]

کر۔۔۔۔۔۔ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔۔۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کرکے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دکان کھولے گا۔۔۔۔۔۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزو مند کیوں تھا۔''

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا'' عجیب و غریب آدمی تھا۔''

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی''۔۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کرسکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں۔ اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از وہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا، ینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔۔۔۔۔۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جاکر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔۔۔۔۔۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔۔۔۔۔۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی، لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جاکر بزازی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا، چونکہ میں مسلمان ہوں۔ اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کررہا ہے۔''

میں نے ممتاز سے پوچھا۔'' تمہارا خیال غلط تھا؟''

''بالکل۔۔۔۔۔۔ اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔۔۔ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔''

جگل نے سوال کیا۔'' یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا!''

'' اس کی موت پر'' یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔'' فسادات شروع ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔ میں علی الصبح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمدورفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم

بھی نہیں چلی رہی تھی۔۔۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا، تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا(مزدور) سو رہا ہے۔۔۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رک گیا۔۔۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔۔۔ میں پھر رک گیا آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، مگر خون کے دھبوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔۔۔۔۔۔ اس کی ٹول کی سفید قمیض جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔۔۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کردیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دو بار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا۔۔۔۔۔۔
میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ ''آپ؟۔۔۔آپ؟''

میں نے اس سے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کردی۔وہ کیسے ادھر آیا۔ کس نے اس کو زخمی کیا۔ کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔۔۔۔۔۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں؟

''اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کرڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ میرے دن پورے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔ بھگوان کو یہی منظور تھا!''

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔۔۔۔۔۔ میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ پچھ کے لیے دھیر لیا جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ ایک بار خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچے، مرنا تو ہے، کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔۔۔۔۔۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔۔۔۔۔۔ بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔۔۔۔۔۔ میں ٹھہر گیا۔۔۔۔۔۔ نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔۔۔۔۔۔

میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں بے جاتا ہے------ اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی قمیض کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا ''------نیچے بنڈی ہے------ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں------یہ------یہ سلطانہ کا مال ہے------ میں نے------ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا------ آج اسے------ آج اسے بھیجنے والا تھا------ کیونکہ------ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے------ آپ اسے دے دیجیے گا اور------ کہئے گا فوراً چلی جائے------ لیک------ اپنا خیال رکھیے گا!''

ممتاز خاموش ہوگیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز، سہائے کی آواز میں جو جے جے ہسپتال کے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، اُدھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہورہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا۔ ''میں سلطانہ سے ملا------ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔''

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا------ اس کا داہنا ہاتھ ہِل رہا تھا------ میں جگل سے مخاطب ہوا۔ ''کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز، سہائے کی روح کو بلا رہا ہے------ ہم سفر بنانے کے لیے؟''

جگل نے صرف اتنا کہا۔ ''کاش، میں سہائے کی روح ہوتا!''

پڑھئے کلمہ

لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔ آپ مسلمان ہیں یقین کریں میں جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔ پاکستان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قائداعظم جناح کے لیے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں اس معاملے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اتنی جلدی نہ کیجیے۔۔۔۔۔۔۔ مانتا ہوں۔ ان دنوں ہلڑ کے زمانے میں آپ کو فرصت نہیں، لیکن آپ خدا کے لیے میری پوری بات تو سن لیجیے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تکا رام کو ضرور مارا ہے، اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں تیز چھری سے اس کا پیٹ چاک کیا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ وہ ہندو تھا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے اس لیے نہیں مارا تو پھر کس لیے مارا۔۔۔۔۔۔۔ لیجیے میں ساری داستان ہی آپ کو سُنا دیتا ہوں۔

پڑھئے کلمہ، لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔ کس کافر کو معلوم تھا کہ میں اس لفڑے میں پھنس جاؤں گا۔ پچھلے ہندو مسلم فساد میں میں نے تین ہندو مارے تھے۔ لیکن آپ یقین مانئے وہ مارنا کچھ اور ہے، اور یہ مارنا کچھ اور ہیے۔ خیر، آپ سنئے کہ ہوا کیا، میں نے اس تکا رام کو کیوں مارا۔

کیوں صاحب عورت ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کے چلتروں سے خدا ہی بچائے۔۔۔۔۔۔۔ پھانسی سے بچ گیا تو دیکھیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ پھر کبھی کسی عورت کے نزدیک نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن صاحب عورت بھی اکیلی سزاوار نہیں۔ مرد سالے بھی کم نہیں ہوتے۔ بس، کسی عورت کو دیکھا اور ریشہ خطمی ہوگئے۔ خدا کو جان دینی ہے۔ انسپکٹر صاحب! رکما کو دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔
اب کوئی مجھ سے پوچھے۔ بندہ خدا تو ایک پینتیس روپے کا ملازم، تجھے بھلا عشق سے کیا کام۔ کرایہ وصول کر اور چلتا بن۔ لیکن آفت یہ ہوئی صاحب کہ ایک دن جب میں سولہ نمبر کی کھولی کا کرایہ وصول کرنے گیا اور دروازہ ٹھوکا تو

اندر سے رکما بائی نکلی۔یوں تو میں رکما بائی کو لئی دفعہ دیکھ چکا تھا لیلن اس دن لم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک پتلی دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے، جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور زور سے مالش کردوں۔ بس صاحب اسی روز سے اس بندہ نابکار نے اپنا دل، دماغ سب کچھ اس کے حوالے کردیا۔

کیا عورت تھی۔۔۔۔۔۔ بدن تھا پتھر کی طرح سخت مالش کرتے کرتے ہانپنے لگ گیا تھا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی یہی کہتی رہی '' تھوڑی دیر اور''

شادی شدہ۔۔۔۔۔۔ جی ہاں شادی شدہ تھی اور خان چوکیدار نے کہا تھا کہ اس کا ایک یار بھی ہے۔ لیکن آپ سارا قصہ سُن لیجیے۔۔۔۔۔۔ یار وار سب ہی اس میں آجائیں گے۔

جی ہاں، بس اس روز سے عشق کا بھوت میرے سر پر سوار ہوگیا۔ وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی کیونکہ کبھی کبھی کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن خدا گواہ ہے جب بھی وہ مسکرائی، میرے بدن میں خوف کی ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ معشوق کو پاس دیکھنے کا۔۔۔ وہ۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا۔۔۔۔۔۔ لیکن آپ شروع ہی سے سُنیے۔

وہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رکما بائی سے میری آنکھ لڑگئی تھی۔ اب دن رات میں سوچتا تھا کہ اسے پٹایا کیسے جائے۔ کم بخت، اس کا خاوند ہر وقت کھولی میں بیٹھا لکڑی کے کھلونے بناتا رہتا، کوئی چانس ملتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن بازار میں نے اس کے خاوند کو جس کا نام۔۔۔۔۔۔ خدا آپ کا بھلا کرے کیا تھا جی ہاں۔۔۔۔۔۔ گردھاری۔۔۔۔۔۔ لکڑی کے کھلونے چادر میں باندھے لے جاتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے سولہ نمبر کی کھولی کا رخ کیا۔ دھڑکتے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا۔ رکما بائی نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ خدا کی قسم میری روح لرز گئی۔

بھاگ گیا ہوتا وہاں سے، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کرکے مجھ سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ!'' میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آکر [illegible]

کہا۔ دیکھو میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے، تمہاری مراد پوری نہیں ہو سکتی۔
میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پاس دیکھ کر میرا خون گرم ہوگیا تھا۔ کنپٹیاں ٹھک ٹھک کررہی تھیں۔ کم بخت نے آج بھی بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور وہی پتلی دھوتی لپیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور دبا کر کہا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' ۔ اف! اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے۔۔۔۔۔۔ عرض کرتا ہوں۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔

خیر، آپ داستان سنیے۔

میں اور زیادہ گرم ہوگیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ ''گردھاری جائے جہنم میں۔۔۔۔۔۔ تمہیں میری بننا ہوگا۔'' رکما نے مجھے اپنے جسم سے الگ کیا اور کہا۔ ''دیکھو تیل لگ جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لگنے دو۔'' اور پھر اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔۔۔۔۔۔یقین مانیے اگر اس وقت آپ مارے کوڑوں کے میری پیٹھ کی چمڑی ادھیڑ دیتے، تب بھی میں اسے علیحدہ نہ کرتا۔ لیکن کم بخت نے ایسا پچکارا کہ جہاں اس نے مجھے پہلے بٹھایا تھا، خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ سوچ کیا رہی ہے۔ گردھاری سالا باہر ہے، ڈر کس بات کا ہے۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''رکما! ایسا اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔''

اس نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔ ''اس سے بھی اچھا موقع ملے گا۔۔۔۔۔۔ لیکن تم یہ بتاؤ جو کچھ میں کہوں گی کرو گے۔''۔۔۔۔۔۔ صاحب میرے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ میں نے جوش میں آکر جواب دیا۔ ''تمہارے لیے میں پندرہ آدمی قتل کرنے کو تیار ہوں۔'' یہ سن کر وہ مسکرائی۔ ''مجھے وشواس ہے۔'' خدا کی قسم ایک بار پھر میری روح لرز گئی۔ لیکن میں نے سوچا شاید زیادہ جوش آنے پر ایسا ہوا ہے۔

بس وہاں میں تھوڑی دیر اور بیٹھا پیار اور محبت کی باتیں کیں، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھجئے کھائے اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ گو وہ سلسلہ نہ ہوا، لیکن صاحب ایسے سلسلے پہلے ہی دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، پھر سہی! دس دن گزر گئے۔ ٹھیک گیارہویں دن، رات کے دو بجے ہاں دو ہی کا عمل تھا۔۔۔۔۔۔ کسی نے مجھے آہستہ سے جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس، جو جگہ ہے نا، وہاں سوتا ہوں۔

آنکھیں کھول میں نے دیکھا۔ ارے رکما بائی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا ہے۔'' اس نے ہولے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ'' ۔۔۔۔۔۔ میں ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس نے میرے کان میں کہا۔ '' ابھی ٹھہرو۔'' پھر بتی روشن کی میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سو رہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔ ''یہ کیا؟'' رکما نے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' میں الو کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔۔۔۔۔۔ بالکل برف ہوگیا۔

صاحب۔۔۔۔۔۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔۔۔۔۔۔ جانتے ہیں رکما نے مجھ سے کیا کہا۔۔۔۔۔۔

پڑھیے کلمہ! لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی۔۔۔۔۔۔ کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔۔۔۔۔۔ ''میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے۔'' ۔۔۔۔۔۔ آپ یقین کیجیے اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہٹے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا۔۔۔۔۔۔ کیا عورت تھی صاحب۔۔۔۔۔۔ مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے، قسم خداوند پاک کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا۔ بجلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسی سی تھی۔ لکڑی پھنسا کر اس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دیے تھے کہ بے چارے کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔۔۔۔۔۔ کہتی تھی بس یوں چٹکیوں میں کام تمام ہوگیا تھا۔

کپڑا اُٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہوگئیں۔ لیکن وہ عورت جانے کیا تھی۔ وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ قرآن کی قسم! میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لیے نامرد ہوگیا ہوں۔ مگر صاحب جب اس کا گرم گرم پنڈا میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ زندگی بھر وہ رات مجھے یاد رہے گی۔۔۔۔۔۔ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رکما

اور میں دونوں اس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہُوئے تھے۔

صبح ہُوئی تو ہم دونوں نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کیے اوزار اس کے موجود تھے، اس لیے زیادہ تکلیف نہ ہُوئی۔ ٹھک ٹھک کافی ہوئی تھی پر لوگوں نے سمجھا ہوگا گردھاری کھلونے بنا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ آپ پوچھیں گے بندۂ خدا تم نے ایسے گھناؤنے کام میں کیوں حصہ لیا۔ پولیس میں رپٹ کیوں نہ لکھوائی۔۔۔۔۔۔ صاحب، عرض یہ ہے کہ اس کم بخت نے مجھے ایک ہی رات میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو شاید میں نے پندرہ آدمیوں کا خون بھی کرہی دیا ہوتا۔ یاد ہے نا! میں نے ایک دفعہ اس سے جوش میں آکر کیا کہا تھا۔۔۔۔۔۔

اب مصیبت یہ تھی کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ رکما کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات تھی۔ میں نے اس سے کہا جان من تم کچھ فکر نہ کرو۔ فی الحال ان ٹکڑوں کو ٹرنک میں بند کردیتے ہیں۔ جب رات آئے گی تو میں اُٹھا کر لے جاؤں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا صاحب کہ اس روز ہلڑ ہوا۔ پانچ چھ علاقوں میں خوب مارا ماری ہوئی۔ گورنمنٹ نے چھتیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا۔ میں نے کہا عبدالکریم! کچھ بھی ہو، لاش آج ہی ٹھکانے لگا دو۔۔۔۔۔۔ چنانچہ دو بجے اُٹھا۔۔۔۔۔۔ اوپر سے ٹرنک لیا۔ خدا کی پناہ! کتنا وزن تھا۔ مجھے ڈر تھا رستے میں کوئی پیلی پگڑی والا ضرور ملے گا اور کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی میں دھر لے گا۔ مگر صاحب، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے جس بازار سے گزرا، اس میں سناٹا تھا۔ ایک جگہ ۔۔۔۔۔۔ بازار کے پاس مجھے ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ میں نے ٹرنک کھولا اور لاش کے ٹکڑے نکال کر اندر ڈیوڑھی میں ڈال دیے اور واپس چلا آیا۔

قربان اس کی قدرت کے صبح پتہ چلا کہ ہندوؤں نے اس مسجد کو آگ لگا دی۔ میرا خیال ہے گردھاری اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ اخباروں میں کسی لاش کا ذکر نہیں تھا۔ اب صاحب، بقول شخصے میدان خالی تھا۔ میں نے رکما سے کہا چالی میں مشہور کردو کہ گردھاری باہر کام گیا ہے۔ میں رات کو دو ڈھائی بجے آجایا کروں گا اور عیش کیا کریں گے۔۔۔۔۔۔ مگر اس نے کہا نہیں عبدل، اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم کو کم از کم پندرہ بیس روز تک نہیں ملنا چاہیے۔ بات معقول تھی، اس لیے میں خاموش رہا۔

سترہ روز گزر لئے۔۔۔۔۔۔ لئی بار ڈراؤنے خوابوں میں گردھاری آیا۔ لیکن میں نے کہا۔۔۔ سالے مر لھپ چکا ہے۔ اب میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اٹھارہویں روز صاحب میں اسی طرح سیڑھیوں کے پاس چارپائی پر سو رہا تھا کہ رکما رات کے بارہ۔۔۔۔۔۔ بارہ نہیں تو ایک ہوگا۔ آئی اور مجھے اوپر لے گئی۔

چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''عبدل میرا بدن دُکھ رہا ہے، ذرا چمپی کردو۔

میں نے فوراً تیل لیا اور مالش کرنے لگا لیکن آدھے گھنٹے میں ہی ہانپنے لگا۔ میرے پسینے کی کئی بوندیں اس کے چکنے بدن پر گریں۔ لیکن اس نے یہ نہ کہا، بس کر عبدل۔ تم تھک گئے ہو۔ آخر مجھے ہی کہنا پڑا۔ ''رکما بھئی، اب خلاص۔۔۔۔۔۔'' وہ مسکرائی۔۔۔۔۔۔ میرے خدا کیا مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر بتی بجھائی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔ چمپی کر کر کے میں اس قدر تھک گیا تھا کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ رکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔

جانے کیا بجا تھا۔ میں ایک دم ہڑبڑا کے اٹھا۔ گردن میں کوئی سخت سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔ فوراً مجھے اس تار والی رسی کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرسکوں، رکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ایک دو ایسے مروڑے دیے کہ میری گردن کڑکڑ کر بول اُٹھی۔ میں نے شور مچانا چاہا، لیکن آواز میرے پیٹ میں رہی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہوگیا۔

میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔ گردن میں بہت زور کا درد تھا۔ میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا اور ہولے ہولے ہاتھ سے رسی کے مروڑے کھولنے شروع کیے۔۔۔۔۔۔ ایک دم آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔ جو آوازیں آرہی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔ رکما ہانپ رہی تھی۔۔۔ ہانپتے ہانپتے اس نے کہا۔ ''تکا رام! بتی جلا دو''۔۔۔۔۔۔ تکا رام نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نہیں نہیں، رکما نہیں۔۔۔۔۔۔'' رکما بولی۔۔۔ بڑے ڈرپوک ہو۔۔۔ صبح اس کے تین ٹکڑے کرکے لے جاؤ گے کیسے!''۔۔۔

میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہوگیا۔ تکا رام نے کیا جواب دیا۔ رکما نے پھر کیا کہا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتہ نہیں کب ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اٹھ بیٹھا۔ تکا رام کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ رکما نے جلدی سے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔۔۔۔۔۔ صاحب میں آپ سے کیا بیان کروں، میری حالت کیا تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا لیکن ہلنے جلنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔

یہ تکا رام میرے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ہماری چالی میں اکثر آم بیچنے آیا کرتا تھا۔ رکما نے اس کو کیسے پھنسایا، اس کا مجھے علم نہیں۔

رکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے مار چکی تھی۔ لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔ خیر وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہُوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ رکما نے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا، پڑوس کے آدمی تھے۔

انھوں نے رکما سے پوچھا۔ ''خیریت ہے۔ ابھی ابھی ہم نے چیخ کی آواز سُنی تھی۔'' رکما نے جواب دیا۔ ''خیریت ہے۔ مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔۔۔۔۔۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی اور ڈر کر منہ سے چیخ نکل گئی۔'' پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے۔ رکما نے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔۔۔۔۔۔ آپ یقین مانیے یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی، ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آگئی۔ بلکہ میں نے ارادہ کرلیا کہ رکما کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھانک رہی ہے۔ میں ایک دم لپکا۔ چوتڑوں پر سے اُوپر اُٹھایا اور باہر دھکیل دیا۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا۔ دھپ سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ ساری رات میں چارپائی پر لیٹا اپنی گردن پر جو بہت بُری طرح زخمی ہورہی تھی۔۔۔۔۔۔ آپ نشان دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ تیل مل مل کر سوچتا رہا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔۔۔۔۔۔ اس نے پڑوسیوں سے کہا تھا کہ اسے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔

مکان کے اس طرف جہاں میں نے اسے گرایا تھا جب اس کی لاش دیکھی جائے گی، تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سوتے

میں چلی ہے اور کھڑکی سے باہر گر پڑی ہے۔۔۔۔۔۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔ گردن پر میں نے رومال باندھ لیا تاکہ زخم دکھائی نہ دیں۔ نو بج گئے بارہ ہو گئے مگر رکما کی لاش کی کوئی بات ہی نہ ہُوئی۔ جدھر میں نے اس کو گرایا تھا۔ ایک تنگ گلی ہے۔ دو بلڈنگوں کے درمیان دو طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ اندر داخل ہو کر پیشاب پاخانہ نہ کریں۔ پھر بھی دو بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پھینکا ہوا کچرا کافی جمع ہوتا ہے جو ہر روز صبح سویرے بھنگن اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید بھنگن نہیں آئی، آئی ہوتی تو اس نے دروازہ کھولتے ہی رکما کی لاش دیکھی ہوتی اور شور برپا کر دیا ہوتا۔ قصّہ کیا تھا! میں چاہتا تھا کہ لوگوں کو جلد اس بات کا پتہ چل جائے۔ دو بج گئے تو میں نے جی کڑا کرا کے خود ہی دروازہ کھولا۔ لاش تھی نہ کچرا یا مظہر العجائب! رکما گئی کہاں۔۔۔۔۔۔ قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے اس پھانسی کے پھندے سے بچ نکلنے کا اتنا تعجب نہیں ہوگا جتنا کہ رکما کے غائب ہونے کا ہے۔ تیسری منزل سے میں نے اُسے گرایا تھا، پتھروں کے فرش پر۔ بچی کیسے ہوگی۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر سوال ہے کہ اس کی لاش کون اُٹھا کر لے گیا۔ عقل نہیں مانتی، لیکن صاحب کچھ پتہ نہیں وہ ڈائن زندہ ہو۔۔۔۔۔۔ چالی میں تو یہی مشہور ہے کہ یا تو کسی مسلمان نے گھر ڈال لیا ہے یا ر مار ڈالا ہے۔۔۔۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔۔۔۔۔۔ مار ڈالا ہے تو اچھا کیا ہے۔ گھر ڈال لیا ہے تو جو حشر اس غریب کا ہوگا آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔۔۔۔ خدا بچائے صاحب۔

اب تکا رام کی بات سنئے۔ اس واقعے کے ٹھیک بیس روز بعد وہ مجھ سے ملا اور پوچھنے لگا۔ ''بتاؤ! رکما کہاں ہے''۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ علم نہیں۔'' کہنے لگا۔ ''نہیں، تم جانتے ہو۔''۔۔۔۔۔۔ میں نے جواب دیا۔ ''بھائی قرآن مجید کی قسم! مجھے کچھ معلوم نہیں''۔۔۔۔۔۔ بولا ''نہیں، تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے اُسے مار ڈالا ہے۔ میں پولیس میں رپٹ لکھوانے والا ہوں کہ پہلے تم نے گردھاری کو مارا پھر رکما کو''۔۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا۔ لیکن صاحب میرے پسینے چھوٹ گئے۔ بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ ایک ہی بات سوجھی کہ اس کو ٹھکانے لگا دوں۔۔۔۔۔۔ آپ ہی سوچیے اس کے علاوہ اور علاج بھی کیا تھا۔ چنانچہ صاحب اسی وقت چھپ کر چھری تیز کی اور تکا رام کو ڈھونڈنے نکل پڑا۔۔۔۔۔۔ اتفاق کی بات ہے شام کو چھ بجے وہ مجھے۔۔۔۔۔۔

اسٹریٹ کے ناکے پر موتری کے پاس مل گیا۔ موسمبیوں کی خالی ٹوکری باہر رکھ کر وہ پیشاب کرنے کے لیے اندر گیا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے۔ دھوتی کھول ہی رہا تھا کہ میں نے زور سے پکارا۔ ''تکارام'' ۔۔۔۔۔۔ پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ چھری میرے ہاتھ ہی میں تھی۔ ایک دم اس کے پیٹ میں بھونک دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی باہر نکلتی ہوئی انتڑیاں تھامیں اور دوہرا ہو گر پڑا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ باہر نکل کر نو دو گیارہ ہو جاتا مگر بے وقوفی دیکھئے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا کہ آیا مرا ہے یا نہیں۔ میں نے اتنا سنا تھا کہ نبض ہوتی ہے، انگوٹھے کی طرف یا دوسری طرف، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر لگ گئی۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل پتلون کے بٹن کھولتے کھولتے اندر آیا اور میں دھر لیا گیا۔ بس صاحب یہ ہے پوری داستان ۔۔۔۔۔۔ پڑھیے کلمہ، لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ! جو میں نے رتی بھر بھی جھوٹ بولا ہو۔

گورکھ مکھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اِکا دُکا واردات ہوتی تھیں، اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی جن میں چاقو چھریوں کے علاوہ کرپانیں، تلواریں اوربندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے، جونہی ٹھنڈا ہوا، فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اس سے پہلے ایسے کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیر پا نہیں تھے۔ دس سے پندرہ روز تک مار کٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا، پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کرکے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلووں کا زور دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا، اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحیی ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فی صدی یقین تھا کہ صورتحال بہت جلد درست ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظِ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کرلیا تھا۔ اس طرح سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہوگئیں تو انھیں کھانے پینے کے معاملے میں تردو نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی ممٹی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہوگئی تھی، اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے سے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی

وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنا بند ہوگیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے مسلمان آہستہ آہستہ جارہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا۔ ''بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہو جائے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلہ جس میں میاں عبدالحیی کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحبِ فراش ہوگئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت سمجھنے لگا۔

وہ بازار جو اُن کے مکان کے ساتھ ملحق تھا سنسنان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراندتامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا۔ ''خدا کے لیے، تم ہی کچھ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں، مگر تم جاؤ۔۔۔۔۔۔ کسی کو بھی بلا لاؤ۔ اباجی کی حالت بہت خطرناک ہے۔''

بشارت گیا، مگر فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں نے اس نے ایک لاش دیکھی تھی، خون سے تربتر۔۔۔۔۔۔ اور پاس ہی بہت سے آدمی ڈھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر شکر کے بیٹھ گئی۔ مگر اُس سے اپنے باپ کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہوگیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے فضل وکرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دو رہ گئے تھے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائیگی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روزِ قیامت ہو، کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغریٰ اور بشارت ایک لحظے کے لیے بھی سو نہیں سکتے تھے۔ صغریٰ کو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے

لیے جاگنا پڑتا تھا، مگر اب یہ دھماکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف۔۔۔۔۔۔ ستر برس کا بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پر اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔

ایک روز تنگ آکر صغریٰ اس پر برس پڑی۔ ''تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو، میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقعہ آیا ہے تو دمے کا بہانہ کرکے یہاں پڑے رہتے ہو۔۔۔۔۔۔ وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کردیتے تھے۔''

صغریٰ اپنا جی ہلکا کرکے چلی گئی۔ بعد میں اس کو افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے۔ بشارت نے گھر میں اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اُسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چکے تھے۔ جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بے تاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ہٹیلا ٹکڑہ جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انھیں مگر اب چاروں صرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں ممٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں لوگوں کے سائے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے، مگر معلوم نہیں یہ چاند دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آگیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہو گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کیے ہوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس و حرکت لیٹے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آکر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انھوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے

ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی متاثر ہوئیں، مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے۔ ''اللہ تبارک و تعالیٰ سب ٹھیک کردے گا۔''

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہوگیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے۔ ''دیکھو، کون ہے!''

صغریٰ نے سوچا کہ شاید بڈھا اکبر ہو۔ اس خیال ہی سے اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا۔ ''جاؤ دیکھو۔۔۔۔۔۔شاید اکبر آیا ہے۔''

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ ''نہیں۔۔۔۔۔۔یہ اکبر نہیں ہے۔''

صغریٰ نے کہا۔ ''تو اور کون ہو سکتا ہے ابا جی؟''

میاں عبدالحیی نے اپنی قوتِ گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آگیا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر، ایک نیچے، صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا۔

''ایک سکھ ہے!''

صغریٰ کی چیخ نکل گئی۔ ''سکھ؟۔۔۔۔۔۔کیا کہتا ہے؟''

بشارت نے جواب دیا۔ ''کہتا ہے دروازہ کھولو۔''

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحیٔ کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ ''جاؤ۔۔۔۔۔۔گورمکھ سنگھ ہے!''

بشارت نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی اور ہے؟''

میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''جاؤ صغریٰ وہی ہے!''

صغریٰ اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویوں کا ایک تھیلا لیکر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ''سردار جی، آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔'' مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا۔ '' میاں صاحب واہگورو جی کی کرپا

سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔یہ تو ایک تحفہ یہ جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا۔ اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی۔۔۔۔۔۔ خدا آپ خوش رکھے۔''

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہوگیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہوگا، مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اس نے کیوں کہا کوئی اور ہے۔۔۔۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے۔یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھے، اس کے متعلق وہ ابھی فیصلہ ہی کررہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی ہے۔ ''کون ہے؟''

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا اور صغریٰ سے کہا۔ ''اس میں سے دیکھو؟''

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا۔ وہ تو بہت بوڑھا تھا، لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک دینے والا سے پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''جی۔۔۔۔۔۔جی میں۔۔۔۔۔۔ میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔۔ سنتوکھ!''

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہوگیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا۔ ''فرمائیے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''جی۔۔۔۔۔۔جج صاحب کہاں ہیں۔''

صغریٰ نے جواب دیا۔ ''بیمار ہیں۔''

سردار سنتوکھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا۔ ''اوہ۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے کاغذ کا تھیلا کھڑکھڑایا۔ ''جی یہ سویاں ہیں۔۔۔۔۔۔ سردار جی کا دیہانت ہوگیا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ مر گئے ہیں!''

صغریٰ نے جلدی سے پوچھا۔ ''مر گئے ہیں؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''جی ہاں۔۔۔۔۔۔ ایک مہینہ ہوگیا ہے۔۔۔۔۔۔ مرنے سے پہلے انھوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹھا، میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برسوں سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں۔۔۔یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔ میں نے انھیں بچن دیا تھا۔ جو میں پورا کررہا ہوں۔۔۔۔۔۔

سے بسے سویاں۔

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا۔ ''خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے۔''

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''جج صاحب بیمار ہیں؟''

صغریٰ نے جواب دیا۔ ''جی ہاں!''

''کیا بیماری ہے؟''

''فالج''

''اوہ۔۔۔۔۔۔سردار جی زندہ ہوتے تو یہ انھیں یہ سُن کر بہت دکھ ہوتا۔۔۔۔۔۔مرتے دم تک انھیں جج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔۔۔۔۔۔ اللہ میاں انھیں زندہ رکھے۔۔۔۔۔۔انھیں میرا سلام۔''

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اتر گیا۔۔۔۔۔۔ صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے اور کہے کہ جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ جج صاحب کے مکان سے تھڑے سے اتر کر چند گز کے آگے بڑھا تو چار ڈھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا۔ ''کیوں سردار جی، اپنا کام کر آئے؟''

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''ہاں کر آیا۔''

اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا۔ ''تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔جیسے تمہاری مرضی!'' یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

5 اکتوبر 1951ء

ہرنام کور

نہال سنگھ کو بہت ہی الجھن ہورہی تھی۔ سیاہ و سفید اور پتلی مونچھوں کا ایک گچھا اپنے منہ میں چوستے ہوئے وہ برابر دو ڈھائی گھنٹے سے اپنے جوان بیٹے بہادر کی بابت سوچ رہا تھا۔

نہال سنگھ کی ادھیڑ مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کھلا میدان تھا جس پر وہ بچپن میں بنٹوں سے کبڈی تک تمام کھیل کھیل چکا تھا۔ کسی زمانے میں وہ گاؤں کا سب سے نڈر اور جیالا جوان تھا۔ کماد اور مکئی کے کھیتوں میں نے اس کئی ہٹیلی مٹیاروں کو کلائی کے ایک ہی جھٹکے سے اپنی مرضی کا تابع بنایا۔ تھوک پھینکتا تھا تو پندرہ گز دور جا کے گرتی تھی۔ کیا رنگیلا سجیلا جوان تھا۔ لہریا پگڑی باندھ کر اور ہاتھ میں چھوی لے کر جب میلے ٹیلے کو نکلتا تو بڑے بوڑھے پکار اٹھتے۔ ''کسی کو سندر جاٹ دیکھنا ہے تو سردار نہال سنگھ کو دیکھ لے۔''

سندر جاٹ تو ڈاکو تھا۔ بہت بڑا ڈاکو جس کے گانے ابھی تک لوگوں کی زبان پر تھے لیکن نہال سنگھ ڈاکو نہیں تھا۔ اس کی جوانی میں دراصل کرپان کی سی تیزی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں اس پر مرتی تھیں۔ ہرنام کور کا قصہ تو ابھی گاؤں میں مشہور تھا کہ اس بجلی نے کیسے ایک دفعہ سردار نہال سنگھ کو قریب قریب بھسم کر ڈالا تھا۔

نہال سنگھ نے ہرنام کور کے متعلق سوچا تو ایک لحظے کے لیے اس کی ادھیڑ ہڈیوں میں بیتی ہوئی جوانی کڑکڑا اٹھی۔ کیا پتلی چھمک جیسی نار تھی۔ چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ جن کو وہ ہر وقت چوستی رہتی۔۔۔۔۔۔ ایک روز جب کہ بیریوں کے بیر پکے ہوئے تھے۔ سردار نہال سنگھ سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔۔۔۔۔۔ وہ زمین پر گرے ہوئے بیر چن رہی تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ چوس رہی تھی۔ نہال سنگھ نے آوازہ کسا۔۔۔۔۔۔ کیہڑے یار دا ایتا ددھ پیتا۔۔۔ سڑگیاں لال بلّیاں؟

ہرنام کور نے پتھر اٹھایا اور تان کر اس کو مارا۔ نہال سنگھ نے چوٹ کی پروا نہ کی اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑلی۔ لیکن وہ بجلی کی سی تیزی سے مچھی کی طرح تڑپ کر الگ ہوگئی اور یہ جا وہ جا۔ نہال سگھ کو جیسے کسی نے چاروں شانے چت گرادیا۔ شکست کا یہ احساس اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جب یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

نہال سنگھ خاموش رہا۔ اس نے دوستوں دشمنوں سب کی باتیں سنیں پر جواب نہ دیا۔ تیسرے روز دوسری بار اس کی مڈبھیڑ گوردوارہ صاحب سے کچھ دور بڑکی گھنی چھاؤں میں ہوئی۔ ہرنام کور اینٹ پر بیٹھی اپنی گرگابی کو کیلیں اندر ٹھونک رہی تھی۔ نہال سنگھ کو پاس دیکھ کر وہ بدکی۔ پر اب کے اس کوئی پیش نہ چلی۔

شام کو جب لوگوں نے نہال سنگھ کو بہت خوش خوش اونچے سروں میں۔ نی ہرنام کورے، اونارے۔۔۔ گاتے

سنا تو ان کو معلوم ہوگیا۔ کون سا قلعہ سر ہوا ہے۔۔۔ لیکن دوسرے روز نہال سنگھ زنا بالجبر کے الزام میں گرفتار ہوا اور تھوڑی سی مقدمے بازی کے بعد اسے چھ سال کی سزا ہوگئی۔

چھ سال کے بجائے نہال سنگھ کو ساڑھے سات کی قید بھگتنی پڑی۔ کیونکہ جیل میں اسکا دو دفعہ جھگڑا ہوگیا تھا۔ لیکن نہال سنگھ کو اس کی کچھ پروانہ تھی۔ قید کاٹ کر جب گاؤں روانہ ہوا اور ریل کی پٹڑی طے کرکے مختلف پگڈنڈیوں سے ہوا ہوا گوردوارے کے پاس سے گزر کر بڑ کے گھنے درخت کے قریب پہنچا تو اس نے کیا دیکھا کہ ہرنام کور کھڑی ہے۔۔۔۔۔۔ اور اپنے ہونٹ چوس رہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ نہال سنگھ کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی چوڑی چھاتی کے ساتھ چمٹ گئی۔

نہال سنگھ نے اس کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور گاؤں کے بجائے کسی دوسری طرف چل دیا۔۔۔۔۔۔ ہرنام کور نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

نہال سنگھ نے نعرہ لگایا۔ ''جو بولے سو نہال ست سری اکال۔'' دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نہال سنگھ نے ہرنام کور سے شادی کرلی اور چالیس کوس کے فاصلے پر دوسرے گاؤں میں آباد ہوگیا۔ یہاں بڑی منتوں سے چھ برس کے بعد بہادر پیدا ہوا اور بیساکھی کے روز جب کہ وہ ابھی پورے ڈھائی مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہرنام کور کے ماتا نکلی اور وہ مرگئی۔

نہال سنگھ نے بہادر کی پرورش اپنی بیوہ بہن کے سپرد کردی جس کی چار لڑکیاں تھیں چھوٹی چھوٹی۔۔۔۔۔۔ جب بہادر آٹھ برس کا ہوا تو نہال سنگھ اسے اپنے پاس لے آیا۔

چار برس ہو چلے تھے کہ بہادر اپنے باپ کی نگرانی میں تھا۔ شکل صورت میں وہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا اسی طرح دبلا پتلا اور نازک۔ کبھی کبھی اپنے پتلے پتلے لال لال ہونٹ چوستا تو نہال سنگھ اپنی آنکھیں بند کرلیتا۔

نہال سنگھ کو بہادر سے بہت محبت تھی۔ چار برس اس نے بڑے چاؤ سے نہلایا دھلایا۔ ہر روز دہی سے خود اس کے کیس دھوتا۔ اسے کھلاتا۔ باہر سیر کے لیے لے جاتا۔ کہانیاں سناتا۔ ورزش کراتا مگر بہادر کو ان چیزوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اداس رہتا۔ نہال سنگھ نے سوچا اتنی دیر اپنی پھوپھی کے پاس جو رہا ہے۔ اس لیے اداس ہے۔ چنانچہ پھر اس کو اپنی بہن کے پاس بھیج دیا اور خود فوج میں بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا۔

چار برس اور گزر گئے۔ لڑائی بند ہوئی اور نہال سنگھ جب واپس آیا تو وہ پچاس برس کے بجائے ساٹھ باسٹھ برس کا لگتا تھا۔ اس لیے اس نے جاپانیوں کی قید میں ایسے دکھ جھیلے تھے کہ سن کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

اب بہادر کی عمر نہال سنگھ کے حساب کے مطابق سولہ کے لگ بھگ تھی مگر وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا چار برس پہلے تھا۔۔۔ دبلا پتلا۔۔۔ لیکن خوبصورت۔

نہال سنگھ نے سوچا کہ اس کی بہن نے بہادر کی پرورش دل سے نہیں کی۔ اپنی چار لڑکیوں کا دھیان رکھا جو بچھیروں کی طرح ہر وقت آنگن میں کڈکڑے لگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جھگڑا ہوا اور وہ بہادر کو وہاں سے اپنے گاؤں لے گیا۔ لام پر جانے سے اس کے کھیت کھلیان اور گھر بار کا ستیاناس ہوگیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے نہال سنگھ نے ادھر دھیان دیا اور بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب ٹھیک ٹھاک کرلیا اس کے بعد اس نے بہادر کی طرف توجہ دی۔ اس کے لیے ایک بھوری بھینس خریدی۔ مگر نہال سنگھ کو اس بات کا دکھ ہی رہا کہ بہادر کو دودھ، دہی اور مکھن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جانے کیسی اوٹ پٹانگ چیزیں اسے بھاتی تھیں۔ کئی دفعہ نہال سنگھ کو غصہ آیا مگر وہ پی گیا۔ اس لیے کہ اسے اپنے لڑکے سے بے انتہا محبت تھی۔

حالانکہ بہادر کی پرورش زیادہ تر اس کی پھوپھی نے کی تھی مگر اس کی بگڑی ہوئی عادتیں دیکھ کر لوگ یہی کہتے تھے کہ نہال سنگھ کے لاڈ پیار نے اسے خراب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرح محنت مشقت نہیں کرتا۔ گو نہال سنگھ کی ہرگز خواہش نہیں تھی کہ اس کا لڑکا مزدوروں کی طرح کھیتوں میں کام کرے اور صبح سے لے کر دن ڈھلنے تک ہل چلائے۔ واہگوروجی کی کرپا سے اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ زمینیں تھیں۔ جن سے کافی آمدن ہو جاتی تھی۔ سرکار سے جو اب پنشن مل رہی تھی۔ وہ الگ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی۔ دلی خواہش تھی کہ بہادر کچھ کرے۔۔۔۔۔۔ کیا؟ یہ نہال سنگھ نہیں بتا سکتا تھا۔ چنانچہ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ بہادر سے کیا چاہتا ہے۔ مگر ہر بار بجائے اس کے کہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ اس کی بیتی ہوئی جوانی کے دن ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتے اور وہ بہادر کو بھول کر اس گزرے ہوئے زمانے کی یادوں میں کھو جاتا۔

لام سے آئے نہال سنگھ کو دو برس ہو چلے تھے۔ بہادر کی عمر اب اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔۔۔۔۔۔ اٹھارہ برس کا مطلب یہ ہے کہ بھرپور جوانی۔۔۔۔۔ نہال سنگھ جب یہ سوچتا تو جھنجھلا جاتا۔ چنانچہ ایسے وقتوں میں کئی دفعہ اس نے اپنا سر جھٹک کر بہادر کو ڈانٹا۔ ''نام تیرا میں نے بہادر رکھا ہے۔۔۔ کبھی بہادری تو دکھا۔'' اور بہادر ہونٹ چوس کر مسکرا دیتا۔

نہال سنگھ نے ایک دفعہ سوچا کہ بہادر کی شادی کردے۔ چنانچہ اس نے اِدھر اُدھر کئی لڑکیاں دیکھیں۔ اپنے دوستوں سے بات چیت بھی کی۔ مگر جب اسے جوانی یاد آئی تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ نہیں، بہادر میری طرح اپنی شادی آپ کرے گا۔ کب کرے گا۔ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ بہادر میں ابھی تک اس نے وہ چمک نہیں دیکھی تھی۔ جس سے وہ اندازہ لگاتا کہ اس کی جوانی کس مرحلے میں ہے۔۔۔ لیکن بہادر خوبصورت تھا۔ سندر جاٹ نہیں تھا۔ لیکن سندر ضرور تھا۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، پتلے پتلے لال ہونٹ، ستواں ناک، پتلی کمر۔ کالے بھونرا ایسے کیس مگر بال بہت ہی مہین۔۔۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں دور سے اسے گھور گھور کے دیکھتیں۔ آپس میں کانا پھوسی کرتیں مگر وہ ان کی طرف دھیان نہ دیتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا۔ شاید بہادر کو یہ تمام لڑکیاں پسند نہیں اور یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہرنام کور کی تصویر آگئی۔ بہت دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کو ہٹا کر اس نے گاؤں کی لڑکیاں لیں۔ ایک ایک کرکے وہ ان تمام کو اپنی آنکھوں کے سامنے لایا مگر ہرنام کور کے مقابلے میں کوئی بھی پوری نہ اتری۔۔۔ نہال سنگھ کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ ''بہادر میرا بیٹا ہے۔ ایسی ویسیوں کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا بھی نہیں دیکھے گا۔''

دن گزرتے گئے۔ بیریوں کے بیر کئی دفعہ پکے۔ مکئی کے بوٹے کھیتوں میں کئی دفعہ نہال سنگھ کے قد کے برابر جوان ہوئے۔ کئی ساون آئے مگر بہادر کی یاری کسی کے ساتھ نہ لگی اور نہال سنگھ کی الجھن پھر بڑھنے لگی۔

تھک ہار کر نہال سنگھ دل میں ایک آخری فیصلہ کرکے بہادر کی شادی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک گڑبڑ شروع ہوگئی۔ بھانت بھانت کی خبریں گاؤں میں دوڑنے لگیں۔ کوئی کہتا انگریز جارہا ہے۔ کوئی کہتا روسیوں کا راج آنے والا ہے۔ ایک خبر لاتا کانگرس جیت گئی ہے۔ دوسرا کہتا نہیں ریڈیو میں آیا ہے کہ ملک بٹ جائے گا۔ جتنے منہ، اتنی باتیں۔ نہال سنگھ کا تو دماغ چکرا گیا۔ اسے ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو اسے اس جنگ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس میں وہ پورے چار برس شامل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آرام سے بہادر کی شادی ہو جائے اور گھر میں اس کی بہو آجائے۔

لیکن ایک دم جانے کیا ہوا۔ خبر آئی کہ ملک بٹ گیا ہے۔ ہندو مسلمان الگ الگ ہوگئے ہیں بس پھر کیا تھا چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ چل چلاؤ شروع ہوگیا اور پھر سننے میں آیا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے جارہے ہیں۔ سینکڑوں لڑکیاں اغواء کی جارہی ہیں۔ لاکھوں کا مال لوٹا جارہا ہے۔

کچھ دن گزر گئے تو پکی سڑک پر قافلوں کا آنا جانا شروع ہوا۔ گاؤں والوں کو جب معلوم ہوا تو میلے کا سماں پیدا ہوگیا۔

لوگ سو سو، دو دو سو کی ٹولیاں بنا کر جاتے۔ جب لوٹتے تو ان کے ساتھ کئی چیزیں ہوتیں۔ گائے، بھینس، بکریاں، گھوڑے، ٹرنک، بستر اور جوان لڑکیاں۔

کئی دنوں سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ گاؤں کا ہر جوان کوئی نہ کوئی کارنامہ دکھا چکا تھا حتیٰ کہ کھیا کا ناٹا اور کبڑا لڑکا دریام سنگھ بھی۔۔۔۔۔۔ اس کی پیٹھ پر بڑا کوہان تھا۔ ٹانگیں ٹیڑھی تھیں، مگر یہ بھی چار روز ہوئے پکی سڑک پر سے گزرنے والے ایک قافلے پر حملہ کرکے ایک جوان لڑکی اٹھا لایا تھا۔ نہال سنگھ نے اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خوبصورت تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ لیکن نہال سنگھ نے سوچا کہ ہرنام کور جتنی خوبصورت نہیں ہے۔

گاؤں میں کئی دنوں سے خوب چہل پہل تھی۔ چاروں طرف جوان شراب کے نشے میں دھت بولیاں گاتے پھرتے تھے۔ کوئی لڑکی بھاگ نکلتی تو سب اس کے پیچھے شور مچاتے دوڑتے کبھی لوٹے ہوئے مال پر جھگڑا ہو جاتا تو نوبت مرنے مارنے پر آجاتی۔ چیخ و پکار تو ہر گھڑی سنائی دیتی تھی۔ غرضیکہ بڑا مزیدار ہنگامہ تھا۔ لیکن بہادر خاموش گھر میں بیٹھا رہتا۔

شروع شروع میں تو نہال سنگھ بہادر کی اس خاموشی کے متعلق بالکل غافل رہا۔ لیکن جب ہنگامہ اور زیادہ بڑھ گیا اور لوگوں نے مذاقیہ لہجے میں اس سے کہنا شروع کیا ''کیوں سردار نہال سیاں، تیرے بہادر نے سنا ہے بڑی بہادریاں دکھائی ہیں؟'' تو وہ پانی پانی ہوگیا۔

چوپال پر ایک شام کو یرقان کے مارے ہوئے حلوائی بشیشر نے دون کی پھینکی اور نہال سنگھ سے کہا۔ '' دو تو میرا گنڈا سنگھ لایا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک میں لایا ہوں بندبوتل، اور یہ کہتے ہوئے بشیشر نے زبان سے پٹاخے کی آواز پیدا کی جیسے بوتل میں سے کاگ اڑتا ہے۔ ''نصیبوں والا ہی کھولتا ہے ایسی بندبوتلیں سردار نہال سیاں۔''

نہال سنگھ کا جی جل گیا۔ کیا تھا بشیشر اور کیا تھا گنڈا سنگھ؟ ایک یرقان کا مارا ہوا، دوسرا تپ دق کا۔۔۔۔۔۔ مگر جب نہال سنگھ نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ کیونکہ جو کچھ بشیشر نے کہا حقیقت تھی۔ بشیشر اور اس کا لڑکا گنڈا سنگھ کیسے بھی تھے۔ مگر تین جوان لڑکیاں، ان کے گھر میں واقعی موجود تھیں اور چونکہ بشیشر کا گھر اس کے پڑوس میں تھا۔ اس لیے کئی دنوں سے نہال سنگھ ان تینوں لڑکیاں کے مسلسل رونے کی آواز سن رہا تھا۔

گوردوارے کے پاس ایک روز دو جواں باتیں کررہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

''نہال سنگھ کے بارے میں تو بڑی باتیں مشہور ہیں۔''

''ارے چھوڑ۔ بہادر تو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے۔''

نہال سنگھ سے اب نہ رہا گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے بہادر کو بہت غیرت دلائی اور کہا۔ ''تو نے سنا لوگ کیا کہتے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے تو۔

قسم واہگوروجی کی، تیری عمر کا تھا تو سینکڑوں لڑکیاں میری ان ٹانگوں۔۔۔۔۔۔۔''

نہال سنگھ ایک دم خاموش ہوگیا۔ کیونکہ شرم کے مارے بہادر کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ باہر نکل کر وہ دیر تک سوچتا چلا گیا اور سوچتا سوچتا کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔۔۔ اس کی ادھیڑ مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کُھلا میدان تھا۔ جس پر برنٹوں سے لے کر کبڈی تک تمام کھیل کھیل چکا تھا۔

بہت دیر تک نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا کہ بہادر شرمیلا ہے اور یہ شرمیلا پن اس میں غلط پرورش کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں اپنی بہن کو بہت گالیاں دیں اور فیصلہ کیا کہ بہادر کے شرمیلے پن کو کسی نہ کسی طرح توڑا جائے اور اس کے لیے نہال سنگھ کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی۔

خبر آئی کہ رات کو کچی سڑک پر سے ایک قافلہ گزرنے والا ہے۔ اندھیری رات تھی۔ جب گاؤں سے ایک ٹولی اس قافلے پر حملہ کرنے کیلیے نکلی تو نہال سنگھ بھی ٹھاٹھا باندھ کر ان کے ساتھ ہولیا۔

حملہ ہوا۔ قافلے والے نہتے تھے۔ پھر بھی تھوڑی سی جھپٹ ہوئی۔ لیکن فوراً ہی قافلے والے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حملہ کرنیوالی ٹولی نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار شروع کردی۔ لیکن نہال سنگھ کو مال و دولت کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کسی اور ہی چیز کی تاک میں تھا۔

سخت اندھیرا تھا گو گاؤں والوں نے مشعلیں روشن کی تھیں مگر بھاگ دوڑ اور لوٹ کھسوٹ میں بہت سی بجھ گئی تھیں۔ نہال سنگھ نے اندھیرے میں کئی عورتوں کے سائے دوڑتے دیکھے مگر فیصلہ نہ کرسکا کہ ان میں سے کس پر ہاتھ ڈالے۔ جب کافی دیر ہوگئی اور لوگوں کی چیخ و پکار مدھم پڑنے لگی تو نہال سنگھ نے بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا۔ ایک دم تیزی سے ایک سایہ بغل میں گٹھڑی دبائے اس کے سامنے سے گزرا۔

نہال سنگھ نے اس کا تعاقب کیا۔ جب پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی ہے اور جوان۔۔۔ نہال سنگھ نے فوراً اپنے گاڑھے کی چادر نکالی اور اس پر جال کی طرح پھینکی۔ وہ پھنس گئی۔ نہال سنگھ نے اسے کاندھوں پر اٹھا لیا اور ایک ایسے راستے سے گھر کا رخ کیا کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔

مگر گھر پہنچا تو بتی گُل تھی۔ بہادر اندر کوٹھری میں سو رہا تھا۔ نہال سنگھ نے اسے جگانا مناسب خیال نہ کیا۔ کواڑ کھولا۔ چادر میں سے لڑکی نکال کر اندر دھکیل، باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر زور زور سے کواڑ پیٹے۔ تاکہ بہادر جاگ پڑے۔

جب نہال سنگھ نے مکان کے باہر کھٹیا بچھائی۔ اور بہادر اور اس لڑکی کی مڈبھیڑ کی کپکپاہٹ پیدا کرنے والی باتیں سوچنے کیلیے لیٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ بہادر کی کوٹھڑی کے روشن دانوں میں دیے کی روشنی ٹمٹما رہی ہے۔

نہال سنگھ اچھل پڑا۔ اور ایک لحظے کیلیے محسوس کیا کہ وہ جوان ہے۔ کماد کے کھیتوں میں مٹیاروں کو کلائی سے پکڑنے والا نوجوان۔

ساری رات نہال سنگھ جاگتا رہا اور طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ صبح جب مُرغ بولنے لگے تو وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں جانے لگا۔ مگر ڈیوڑھی سے لوٹ آیا۔ اس نے سوچا کہ دونوں تھک کر سو چکے ہوں گے اور ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔

نہال سنگھ کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی اور وہ کھاٹ پر بیٹھ کر مونچھوں کے بال منہ میں ڈال کر چوسنے اور مسکرانے لگا۔

جب دن چڑھ گیا اور دھوپ نکل آئی تو اس نے اندر جا کر کنڈی کھولی۔ سٹرپٹر کی آوازیں سی آئیں۔ کواڑ کھولے تو اس نے دیکھا کہ لڑکی چارپائی پر کیسری دوپٹہ اوڑھے بیٹھی ہے۔ پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جس پر یہ موٹی کالی چٹیا سانپ کی طرح لٹک رہی تھی۔ جب نہال سنگھ نے کوٹھڑی کے اندر قدم رکھا تو لڑکی نے پاؤں اوپر اٹھا لیے اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔

طاق میں دیا ابھی تک جل رہا تھا۔ نہال سنگھ نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور دفعتہً اسے بہادر کا خیال آیا۔۔۔۔۔۔

بہادر کہاں ہے؟۔۔۔۔۔۔ اس نے کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''بہادر کہاں ہے؟''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک دم سٹرپٹر سی ہوئی اور چارپائی کے نیچے سے ایک اور لڑکی نکلی۔۔۔۔۔۔ نہال سنگھ ہکّا بکّا رہ گیا۔۔۔ لیکن اس نے دیکھا۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ جو لڑکی چارپائی سے نکل کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر دوڑ گئی تھی۔ اس کے داڑھی تھی، منڈی ہوئی داڑھی۔

نہال سنگھ چارپائی کی طرف بڑھا لڑکی جو کہ اس پر بیٹھی تھی اور زیادہ سمٹ گئی مگر نہال سنگھ نے ہاتھ کے ایک جھٹکے

سے اس کا منہ اپنی طرف کیا۔ ایک چیخ نہال سنگھ کے حلق سے نکلی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''ہرنام کور!''
زنانہ لباس، سیدھی مانگ، کالی چٹیا۔۔۔۔۔۔ اور بہادر ہونٹ بھی چوس رہا تھا۔

ڈارلنگ

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے۔ جب مشرقی اور مغربی پنجاب میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کئی دن سے موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ وہ آگ جو انجنوں سے نہ بجھ سکی تھی۔ اس بارش نے چند گھنٹوں ہی میں ٹھنڈی کردی تھی۔ لیکن جانوں پر باقاعدہ حملے ہورہے تھے اور جوان لڑکیوں کی عصمت بدستور غیر محفوظ تھی۔ ہٹے کٹے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں باہر نکلتی تھیں اور اِدھر اُدھر چھاپے مار کر ڈری ڈبکی اور سہمی ہوئی لڑکیاں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

کسی کے گھر پر چھاپہ مارنا اور اس کے ساکنوں کو قتل کرکے ایک جوان لڑکی کو کاندھے پر ڈال کر لے جانا بظاہر بہت ہی آسان کام معلوم ہوتا ہے لیکن 'س' کا بیان ہے کہ یہ محض لوگوں کا خیال ہے۔ کیونکہ اسے تو اپنی جان پر کھیل جانا پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو 'س' کا بیان کردہ واقعہ سناؤں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آپ کو متعارف کرادوں۔ 'س' ایک معمولی جسمانی اور ذہنی ساخت کا آدمی ہے۔ مفت کے مال سے اس کو اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی عام انسانوں کو ہوتی ہے۔ لیکن مالِ مفت سے اس کا سلوک دلِ بے رحم کا سا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک عجیب و غریب ٹریجڈی کا باعث بن گیا۔ جس کا علم اسے بہت دیر میں ہوا۔

اسکول میں 'س' اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ ہر کھیل میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن کھیلتے کھیلتے جب نوبت لڑائی تک جا پہنچی تھی تو 'س' اس میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ کھیل میں وہ ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کر جاتا تھا۔ لیکن لڑائی کے موقع پر اس نے ہمیشہ ایمانداری سے کام لیا۔

مصوری سے 'س' کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن کالج میں داخل ہونے کے ایک سال بعد ہی اس نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر سائیکلوں کی دکان کھول لی۔

فساد کے دوران میں جب اس کی دکان جل کر راکھ ہوگئی تو اس نے لوٹ مار میں حصہ لینا شروع کردیا۔ انتقاماً کم اور تفریحاً زیادہ، چنانچہ اسی دوران میں اس کے ساتھ یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جو اس کہانی کا موضوع ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ منوں پانی برس رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی تیز و تند بارش کبھی نہیں دیکھی۔ میں اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میرے سامنے لوٹے ہوئے مال کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ بے شمار چیزیں تھیں مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری دکان جل گئی تھی۔ مجھے اس کا بھی کوئی اتنا

خیال نہیں تھا شاید اس لیے کہ میں نے لاکھوں کا مال تباہ ہوتے دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، دماغ کی کیا کیفیت تھی۔۔۔ اتنے زور سے بارش ہورہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے اور ہر چیز خشک ہے۔۔۔ جلے ہوئے مردنڈوں کی سی بو آرہی تھی۔ میرے ہونٹوں میں جلتا ہوا سگرٹ تھا۔ اس کے دھوئیں سے بھی کچھ ایسی ہی بو نکل رہی تھی۔۔۔ جانے کیا سوچ رہا تھا اور شاید کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ ایک دم بدن پر کپکپی سی دوڑ گئی اور جی چاہا کہ ایک لڑکی اٹھا کر لے آؤں۔ جونہی یہ خیال آیا۔ بارش کا شور سنائی دینے لگا اور کھڑکی کے باہر ہر چیز پانی میں شرابور نظر آنے لگی۔۔۔۔۔۔ میں اٹھا، سامنے لوٹے ہوئے مال کے ڈھیر سے سگرٹوں کا ایک نیا ڈبہ اٹھا کر میں نے برساتی پہنی اور نیچے اتر گیا۔''

''سڑکیں اندھیری اور سنسان تھیں۔ سپاہیوں کا پہرہ بھی نہیں تھا۔ میں دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اس دوران میں کئی لاشیں مجھے نظر آئیں۔ لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ گھومتا گھامتا میں سول لائنز کی طرف نکل گیا۔ لُک پھری ہوئی سڑک بالکل خالی تھی۔ جہاں جہاں بجری اکھڑی ہوئی تھی۔ وہاں بارش جھاگ بن کر اڑ رہی تھی۔ دفعتہً مجھے موٹر کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی موٹر بیبی آسٹن اندھا دھند چلی آرہی تھی۔ میں سڑک کے عین درمیان میں کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ اس انداز سے ہلانے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔''

''موٹر بالکل پاس آگئی مگر اس کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ چلانے والے نے رخ بدلا۔ میں بھی پینترہ بدل کر ادھر ہوگیا۔ موٹر تیزی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ میں بھی لپک کر ادھر ہولیا۔ موٹر میری طرف بڑھی مگر اب اس کی رفتار دھیمی ہوگئی تھی میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔۔۔۔۔۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا مجھے زور سے دھکا لگا اور میں اکھڑ کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ جسم کی تمام ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں مگر مجھے چوٹ نہ آئی۔ موٹر کے بریک چیخے، پہیئے ایک دم پھسلے اور موٹر تیرتی ہوئی سامنے والے فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک درخت سے ٹکرائی اور ساکت ہوگئی۔ میں اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ موٹر کا دروازہ کھلا اور ایک عورت سرخ رنگ کا بھڑکیلا مومی رین کوٹ پہنے باہر نکلی۔ میری کڑکڑائی ہوئی ہڈیاں ٹھیک ہوگئیں اور جسم میں حرارت پیدا ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے صرف اس کا شوخ رنگ رین کوٹ ہی دکھائی دیا۔ لیکن اتنا اشارہ کافی تھا کہ اس مومی کپڑے میں لپٹا ہوا جو کوئی بھی ہے۔ صنفِ نازک میں سے ہے۔''

''میں جب اس کی طرف بڑھا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ بارش کے لرزتے ہوئے پردے میں سے مجھے دیکھ کر بھاگی۔ مگر میں نے چند گزوں ہی میں اسے جا لیا جب ہاتھ اس کے چکنے رین کوٹ پر پڑا تو وہ انگریزی میں چلائی۔ ''ہلپ ہلپ۔''

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور گود میں اٹھا لیا۔ وہ پھر انگریزی میں چلائی ''ہلپ ہلپ۔۔۔ ہی از کلنگ می۔''

میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔ ''آر یو اے انگلش وومن'' فقرہ منہ سے نکل گیا تو خیال آیا کہ اے کی جگہ مجھے این کہنا چاہیے تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''نو۔''

انگریز عورتوں سے مجھے نفرت ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا ''دَن اِٹ از آل رائیٹ۔''

اب وہ اردو میں چلانے لگی۔ ''تم مار ڈالو گے مجھے۔ تم مار ڈالو گے مجھے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ میں اس کی آواز سے، اس کی شکل و صورت اور عمر کا اندازہ لگا رہا تھا۔ لیکن ڈری ہوئی آواز سے کیا پتہ چل سکتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر سے ہٹہٹانے کی کوشش کی۔ پر اس نے دونوں ہاتھ آگے رکھ دیے۔ میں نے کہا۔ ہٹاؤ اور سیدھا موٹر کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اس کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گیر درست کر کے سلف دبایا تو انجن چل پڑا۔۔۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہینڈل گھمایا۔ گاڑی کو فٹ پاتھ پر سے اتارا اور سڑک میں پہنچ کر اکسلریٹر پر پیر رکھ دیا۔۔۔۔۔۔ موٹر تیرنے لگی۔

گھر پہنچ کر میں نے پہلے سوچا کہ اوپر برساتی ٹھیک رہے گی۔ لیکن اس خیال سے کہ لونڈیا کو اوپر لے جانے میں جھک جھک کرنی پڑے گی۔ اس لیے میں نے نوکر سے کہا۔ دیوانہ خانہ کھول دو۔ اس نے دیوان خانہ کھولا تو میں نے اسے گھپ اندھیرے ہی میں صوفے پر ڈال دیا۔ سارا رستہ خاموش رہی تھی۔ لیکن صوفے پر گرتے ہی چلانے لگی۔ ''ڈونٹ کِل می۔۔۔۔۔ ڈونٹ کِل می پلیز۔''

مجھے ذرا شاعری سوجھی۔ ''آئی وونٹ کِل یو۔۔۔۔۔ آئی وونٹ کِل یو ڈارلنگ۔''

وہ رونے لگی۔ میں نے نوکر سے کہا۔ چلے جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ میں نے جیب سے دیا سلائی نکالی۔ ایک ایک کر کے ساری تیلیاں نکالیں مگر ایک بھی نہ سلگی۔ اس لیے کہ بارش میں ان کے مصالحے کا بالکل فالودہ ہو گیا تھا۔ بجلی کا کرنٹ کئی دنوں سے غائب تھا۔۔۔ اوپر برساتی میں ٹوٹے ہولے مال کے ڈھیر میں کئی بیٹریاں پڑی تھیں۔ لیکن میں نے کہا۔ اندھیرے ہی میں ٹھیک ہے، مجھے کون سی فوٹو گرافی کرنی ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ برساتی اتار کر میں نے ایک طرف پھینک دی اور اس سے کہا۔ ''لائیے میں آپ کا رین کوٹ اتار دوں۔''

میں نیچے صوفے کی جانب جھکا۔ لیکن وہ غائب تھی۔ میں بالکل نہ گھبرایا۔ اس لیے کہ دروازہ نوکر نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں اِدھر اُدھر میں نے اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے

کے ساتھ جھڑکے اور تپائی کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑے۔ فرش پر بیٹھے ہی بیٹھے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو گردن پر جا پڑا۔ وہ چیخی میں نے کہا۔ ''چیختی کیوں ہو۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔''

اس نے پھر سسکیاں لینا شروع کردیں۔ شاید اس کا پیٹ ہی تھا جس پر میرا ہاتھ پڑا۔ وہ دوہری ہوگئی۔ میں نے جیسا بھی بن پڑا اس کے رین کوٹ کے بٹن کھولنے شروع کردیے۔ مومی کپڑا بھی عجیب ہوتا ہے جیسے بوڑھے گوشت میں چکنی چکنی جھریاں پڑی ہوں۔ وہ روتی رہی اور ادھر ادھر لپٹ کر مزاحمت کرتی رہی۔ لیکن میں نے پورے بٹن کھول دیے اسی دوران میں مجھے معلوم وہ کہ وہ ساڑھی پہنے تھی۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا یہ تو ٹھیک رہا۔ چنانچہ میں نے ذرا معاملہ دیکھا۔۔۔۔۔۔ خاصی سڈول پنڈلی تھی جس کے ساتھ میرا ہاتھ لگا۔۔۔۔۔۔ وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ میں پہلے ذرایوں ہی سلسلہ کررہا تھا۔ پنڈلی کے ساتھ جب میرا ہاتھ لگا تو بدن میں چار سو چالیس والٹ پیدا ہوگئے۔ لیکن میں نے فوراً ہی بریک لگا دیے کہ سہج پکے سو میٹھا ہوئے۔۔۔۔۔۔ چنانچہ میں نے شاعری شروع کردی۔

''ڈارلنگ۔ میں تمہیں یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لایا۔۔۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔۔۔۔۔۔ یہاں تم زیادہ محفوظ ہو۔۔۔۔۔۔ جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ لیکن باہر لوگ درندوں کی طرح چیر پھاڑ دیں گے۔۔۔۔۔۔ جب تک یہ فساد ہیں تم میرے ساتھ رہنا۔۔۔۔۔۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، میں نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔ کہ تم گنواروں کے چنگل میں پھنس جاؤ۔۔۔۔۔۔''

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''یو وونٹ کِل می؟''

میں نے فوراً ہی کہا۔ ''نو سر۔''

وہ ہنس پڑی۔۔۔۔۔۔ مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ عورت کو سر نہیں کہا کرتے۔ بہت خفت ہوئی۔ لیکن اس کے ہنس پڑنے سے مجھے کچھ حوصلہ ہوگیا۔ میں نے کہا۔ معاملہ پٹا سمجھو، چنانچہ میں بھی ہنس پڑا۔ ''ڈارلنگ، میری انگریزی کمزور ہے۔''

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اگر تم مجھے مارنا نہیں چاہتے تو یہاں کیوں لائے ہو؟''

سوال بڑا بے ڈھب تھا۔ میں نے جواب سوچنا شروع کیا۔ لیکن تیار نہ ہوا۔ میں نے کہا جو منہ میں آئے کہہ دو۔ ''میں تمہیں مارنا بالکل نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ مجھے یہ کام بالکل اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔۔۔ تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟۔۔۔۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اکیلا تھا۔''

وہ بولی۔ ''تمہارا نوکر تمہارے پاس رہتا ہے۔''

میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا۔ ''اس کا کیا ہے وہ تو نوکر ہے۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ میرے دماغ میں نیکی کے خیال آنے لگے میں نے کہا۔ ہٹاؤ چنانچہ اٹھ کر اس سے کہا۔ ''تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ اٹھو۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم مجھے اس کی پنڈلی کا خیال آگیا اور میں نے زور سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کی گرم گرم سانس میری ٹھوڑی کے نیچے گھس گئی۔ میں نے اٹکل پچو اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر جما دیے۔ وہ لرزنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''ڈارلنگ ڈرو نہیں۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔''

''چھوڑ دو مجھے۔'' کی آواز میں عجیب و غریب قسم کی کپکپاہٹ تھی۔

میں نے اسے اپنی گرفت سے علیحدہ کردیا۔ لیکن فوراً ہی اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ سڑک پر اسے اٹھاتے وقت مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے کولہوں کا گوشت بہت ہی نرم تھا۔۔۔۔۔۔

ایک بات مجھے اور بھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر لٹا دیا اور بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ '' اگر اس میں کوئی قیمتی چیز ہے تو یقین رکھو یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔۔۔۔۔ بلکہ چاہو تو میں بھی تمہیں کچھ دے سکتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''لیکن مجھے چاہیے''

اس نے پوچھا۔ ''کیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تم۔''

وہ خاموش ہوگئی۔۔۔ میں فرش پر بیٹھ کر اس کی پنڈلی سہلانے لگا۔ وہ کانپ اٹھی۔ لیکن میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے جب کوئی مزاحمت نہ کی تو میں نے سوچا کہ مجبوری کی وجہ سے بچاری نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے میری طبیعت کچھ کھٹی سی ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ '' دیکھو میں زبردستی کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں منظور نہیں ہے تو جاؤ۔''

یہ کہہ کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جو کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ میرا بھی دل

[illegible]

اچھلنے لگا۔ میں نے زور سے ڈارلنگ کہا اور اس نے ساتھ چمٹ لیا۔
دیر تک چوما چاٹی ہوتی رہی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کے مجھے ڈارلنگ کہتی رہی۔ میں بھی کچھ اسی قسم کی خرافات بکتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''یہ رین کورٹ اتار دو۔۔۔ بہت ہی واہیات ہے۔''
اس نے جذبات بھری آواز میں کہا۔ ''تم خود ہی اتار دو ناں۔''
میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کوٹ اس کے بازوؤں میں سے کھینچ کر اتار دیا۔
اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''
میں اس وقت اپنا حدود اربعہ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ''تمہارا ڈارلنگ!''
اس نے ''یو آر اے نوٹی بوائے'' کہا اور اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں میں اس کا بلاؤز اتارنے لگا تو اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور التجا کی۔
''مجھے ننگا نہ کرو ڈارلنگ، مجھے ننگا نہ کرو۔''
میں نے کہا۔ ''کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ اس قدر اندھیرا ہے۔''
''نہیں، نہیں!''
''تو اس کا یہ مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔'' اس نے میرے دونوں ہاتھ اٹھا کر چومنے شروع کر دیے اور لرزاں آواز میں کہنے لگی۔ ''نہیں نہیں۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے۔''
عجیب ہی سی بات تھی۔ لیکن میں نے کہا۔ چلو ہٹاؤ چھوڑو بلاؤز کو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو اس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا ''تم ناراض تو نہیں ہو گئے؟''
مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں ناراض ہوں یا کیا کہوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا ''نہیں نہیں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ تم بلاؤز نہیں اتارنا چاہتی ہو، نہ اتارو۔۔۔ لیکن۔۔۔'' اس سے آگے کہتے ہوئے مجھے شرم آگئی۔ لیکن ذرا گول کر کے میں نے کہا۔ '' لیکن کچھ تو ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ ساڑھی اتار دو۔۔۔۔۔۔''۔
''مجھے ڈر لگتا ہے'' یہ کہتے ہوئے اس کا حلق سوکھ گیا۔
میں نے بڑے پیار سے کہا۔ ''کس سے ڈر لگتا ہے۔''
''اسی سے۔۔۔۔۔۔ اسی سے''۔ اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔
میں نے اُسے تسلی دی کہ ڈرنے کی وجہ کوئی بھی نہیں۔ ''میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ لیکن اگر تمہیں واقعی ڈر لگتا

ہے تو جانے دو۔۔۔۔۔۔ دو تین دن یہاں رہو جب میری طرف سے تمہیں پورا اطمینان ہو جائے تو پھر سہی۔''

اس نے روتے روتے کہا۔ ''نہیں نہیں۔'' اور اپنا سر میری رانوں پر رکھ دیا۔

میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے رونا بند کردیا اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لینے لگی۔ پھر ایک دم مجھے اپنے ساتھ زور کے ساتھ بھینچ لیا اور شدت کے ساتھ کانپنے لگی۔ میں نے اسے صوفے پر سے اٹھ کر فرش پر بٹھا دیا اور۔۔۔۔۔۔

کمرے میں دفعتہً روشنی کی لکیریں تیر گئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا ''کون ہے؟'' نوکر کی آواز آئی۔ ''لالٹین لے لیجیے''۔ میں نے کہا۔ ''اچھا''۔ لیکن اس نے آواز بھینچ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''حرج کیا ہے۔ ایک طرف نیچی کرکے رکھ دوں گا۔'' چنانچہ میں نے اٹھ کر لالٹین لی اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔۔۔ اتنی دیر کے بعد روشنی دیکھی تھی۔ اس لیے آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا ''بھئی اتنا بھی کیا ہے۔ تھوڑی دیر روشنی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ جب تم کہو گی اسے گل کردیں گے۔''

چنانچہ میں لالٹین ہاتھ ہی میں لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ساڑھی کا پلو سرکا کہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا ''تم بھی عجیب و غریب لڑکی ہو۔۔۔ اپنے دولھے سے بھی پردہ۔''

یہ کہہ میں سمجھنے لگا کہ وہ میری دولہن ہے اور میں اس کا دولھا۔ چنانچہ اسی تصور کے۔۔۔ تحت میں نے اس سے کہا۔ ''اگر ضد ہی کرنی ہے تو بھئی کرلو۔۔۔۔۔۔ ہمیں آپ کی ہر ادا قبول ہے۔''

ایک دم زور کا دھماکا ہوا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ کہیں بم پھٹا تھا۔ میں نے اس کو دلاسا دیا۔ ''ڈرو نہیں۔۔۔ معمولی بات ہے''۔۔۔ ایک دم مجھے خیال آیا جیسے میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔ چنانچہ اس کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔۔۔۔۔۔ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں نے کیا دیکھا۔۔۔۔۔۔ بہت ہی بھیانک صورت، گال اندر دھنسے ہوئے جن پر گاڑھا میک اپ تھپا تھا۔ کئی جگہوں پر سے اس کی تہہ بارش کی وجہ سے اتری ہوئی تھی اور نیچے سے اصلی جلد نکل آئی تھی جیسے کئی زخموں پر سے پھاہے اتر گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ خضاب لگے خشک اور بے جان بال جن کی سفید جڑیں دانت دکھا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور سب سے عجیب و غریب چیز مومی پھول تھے جو اس نے اس کان سے اس کان تک ماتھے کے ساتھ ساتھ بالوں میں اڑسے ہوئے

تھے۔۔۔۔۔۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی رہی۔ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں سنبھلا تو میں نے لالٹین ایک طرف رکھی اور اس سے کہا ''تم جانا چاہو تو چلی جاؤ!''
اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ میں اس کا رین کوٹ اور بیگ اٹھا رہا ہوں تو خاموش ہو گئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اس کی طرف دیکھے بغیر اس کو دے دیں۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے کھڑی رہی۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔''

یہ واقعہ سُنا کر میں نے 'س' سے پوچھا۔ ''جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟''

'س' نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔''

میں نے اس کو بتایا۔ '' وہ عورت مشہور آرٹسٹ مس 'م' تھی۔''

وہ چلایا۔ ''مس 'م'؟۔۔۔ وہی جس کی بنائی ہوئی تصویروں کی میں اسکول میں کاپی کیا کرتا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہی۔۔۔ ایک آرٹ کالج کی پرنسپل تھی۔ جہاں وہ لڑکیوں کو صرف عورتوں اور پھولوں کی تصویر کشی سکھاتی تھی۔۔۔ مردوں سے اسے سخت نفرت تھی۔''

عزت جہاں کو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ کون ہے جو اس لڑکی کے نام سے واقف نہیں۔ اگر آپ سوشلسٹ ہیں اور بمبئی میں رہتے ہیں تو آپ ضرور عزت سے کئی بار ملاقات کر چکے ہوں گے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس نے اپنی زندگی کے کئی برس اشتراکیت کی تحریک کی نشر و اشاعت میں صرف کیے ہیں اور حال ہی میں ایک غیر معروف آدمی سے شادی کی ہے۔

اس غیر معروف آدمی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ناصر سے میں اس زمانے کا واقف ہوں جب میں اس کو ناصو کہا کرتا تھا۔۔۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ میرا ہم جماعت تھا۔ میں تو اپنی تعلیم بیماری اور مفلسی کے باعث جاری نہ رکھ سکا مگر وہ صرف مفلس تھا۔ اس نے بی اے کا امتحان کسی نہ کسی طرح پاس کر لیا اور بمبئی کی ایک بہت بڑی مل میں ملازم ہو گیا۔

میں ان دنوں بمبئی ہی میں تھا۔ جب وہ دلی کے ایک کارخانے میں کام کرتا کرتا بمبئی آیا اور مل میں ملازم ہوا۔ اس دوران میں اس سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن افسوس ہے کہ چند وجوہ کی بنا پر میں بمبئی میں اپنا قیام جاری نہ رکھ سکا اور مجھے مجبوراً دلی جا کر ایک نہایت ہی ذلیل ملازمت اختیار کرنا پڑی۔

خیر! میں نے دلی کو دو برس کے بعد خیر باد کہا اور بمبئی شہر کا رخ کیا۔ جہاں میرے چند عزیز دوستوں کے علاوہ اب

عزت جہاں بھی رہتی تھی۔ میں خود سوشلسٹ ہوں۔ سوشلزم پر میں نے سینکڑوں مضمون لکھے ہیں مگر وہ مضامین جو میں نے عزت جہاں کے قلم سے مختلف اخباروں میں پڑھے تھے، میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوگئے تھے۔ خدا کے لیے کہیں یہ خیال نہ کیجیے گا کہ مجھے اس سے غائبانہ عشق تھا۔ دراصل مجھے اس لڑکی یا عورت کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا صرف اشتیاق تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں اکثر اس کی سرگرمیوں کا حال پڑھ چکا تھا اور مجھے اس سے بے پناہ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ اس سے ملوں، اس سے باتیں کروں اور جس طرح کالج اور اسکول کے نو گرفتارِ محبت لونڈے اپنے رومانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح میں اس سے اشتراکیت کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار کروں۔

ہم دونوں سیگل سے لے کر کارل مارکس تک اشتراکی فلسفے کی نشو وارتقاء کی باتیں کرتے۔ لینن، لراتسکی اور اسٹالن کے مختلف نظریات پر گفتگو کرتے۔میں ہندوستان کی سوشلسٹ تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ وہ بھی اپنے خیالات مجھے بتاتی۔میں اسے ان نوجوانوں کی کہانیاں سناتا جو کارل مارکس کی کتاب محض اس لیے بغل میں دبائے پھرتے ہیں کہ انھیں دوسروں پر رعب گانٹھنا مقصود ہوتا ہے۔ میں اسے اپنے ایک دوست کی داستان سناتا جس کے پاس سوشلزم پر ہر وہ کتاب جو انگریزی زبان میں چھپ چکی ہے۔ موجود ہے مگر وہ سوشلزم کی الف ب سے بھی واقف نہیں وہ کارل مارکس کا نام اس طرح لیتا ہے جس طرح لوگ اپنے قریبی رشتہ دار میونسپل کمشنروں کا لیتے ہیں۔ میں عزت کو بتاتا کہ اس کے باوجود وہ مخلص آدمی ہے جو سوشلزم کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔

پھر میں اس سے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے متعلق بات چیت کرتا جو سوشلزم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے ملنے اور جنسی تعلقات پیدا کرنے کا موقعہ ملے۔ میں اسے بتاتا کہ پچاس فیصدی لڑکے جو سوشلسٹ تحریک میں شامل ہوتے ہیں شہوت زدہ ہوتے ہیں۔ اپنی ہم جماعت لڑکیوں کو وہ یوں دیکھتے ہیں جیسے ان کی نگاہیں صدیوں کی بھوکی پیاسی ہیں اور اکثر لڑکیاں جو اس تحریک میں شامل ہوتی ہیں۔ سرمایہ داروں کی ہنگامہ پسند بیٹیاں ہوتی ہیں اپنی زندگی میں حادثے پیدا کرنے کے لیے یہ سوشلزم پر چند ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس تحریک کی سرگرم کارکن بن جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آہستہ آہستہ جنسی خواہشات کے خرابے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور کچھ آزادی کی آخری حدود پر پہنچ کر ایک ایسی جذباتی چیز بن جاتی ہیں جو ملک کے نام نہاد لیڈروں کے کھیلنے کے کام آتی

رہتی ہے۔

غرض یہ کہ عزت جہاں سے ہندوستان کی اشتراکی تحریک کے عواقب و عواطف پر سیر حاصل بحث کرنے کا خوب لطف آتا۔ اس کے مضامین سے میں اس کی ذہانت اور بیباک خیالی معلوم کرچکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری ہم خیال ہوگی۔

بمبئی آکر مجھے ایک دوست کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ مکان اور فرنیچر کا بندوبست کرتے کرتے مجھے کئی روز خوار ہونا تھا۔بیوی کو میں دلی ہی چھوڑ آیا تھا۔ اس سے میں نے کہہ دیا تھا کہ جونہی مکان ملے گا۔ میں تمہیں بلا لوں گا۔

میرے سب دوست کنوارے ہیں اور فلم ڈائریکٹر عورتوں کے متعلق آپ کا فلسفہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ چونکہ اسٹوڈیو میں کسی ایکٹرس یا ایکٹر کی لڑکی سے تعلقات پیدا نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ضرورت کے وقت مختلف دلالوں کے ذریعے سے ایک لڑکی منگوا لیتے ہیں۔ رات بھر اسے اپنے پاس رکھتے ہیں اور صبح ہوتے ہی اسے رخصت کردیتے ہیں۔ شادی اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق بیوی ان سے کبھی خوش نہیں رہے گی۔ ''بھائی میں فلم ڈائریکٹر ہوں۔ دن کو شوٹنگ کروں گا تو دن بھر باہر رہوں گا رات کو شوٹنگ کروں گا تو رات بھر باہر رہوں گا۔ دن کو کام کرنے کے بعد رات کو اور رات کو کام کرنے کے بعد دن کو آرام کرنا ضروری ہے۔بیوی مجھ سے اپنے سارے حقوق طلب کرے گی مجھے بتاؤ ایک تھکا ہوا آدمی یہ سارے حقوق کیسے پورے کرسکتا ہے۔ ہر روز ایک نئی لونڈیا اچھی ہے نیند آگئی تو اس سے کہا جاؤ سو رہو۔ اگر اس کی صحبت سے تنگ آگئے تو ٹیکسی کا کرایہ دیا اور چلتا کیا۔ عورت بیوی بنتے ہی ایک بڑا فرض بن جاتی ہے۔ میں چونکہ فرض شناس ہوں اس لیے شادی کا بالکل قائل نہیں۔''

جس دوست کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا ایک دن میں اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک لڑکی ڈھونڈنے گئے۔ دلال جو اس کا پرانا واقف تھا۔ ایک کے بجائے دو ''دکھشنی چھوکریاں'' لے آیا۔ میں بہت سٹپٹایا۔ مگر فوراً ہی میرے دوست نے کہا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ایک اور دو میں فرق ہی کیا ہے؟''

ٹیکسی واپس گھر کی طرف مڑی ہم سب یعنی میں، میرا دوست فلم ڈائریکٹر اور وہ دو کاشٹا پوش لڑکیاں تین سیڑھیاں طے کرکے تیسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ میں نے کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ہی ایک کرسی پر ناصر بیٹھا بڑے انہماک سے میرا اردو ٹائپ رائٹر دیکھ رہا تھا اور اس کے پاس ہی ایک عینک لگی عورت بیٹھی تھی جب اس نے مڑکرہماری طرف دیکھا تو میں پہچان گیا۔۔۔ عزت جہاں تھی۔

میرا دوست ان اجنبیوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ لیکن دونوں ''دکھشنی چھوکریاں'' اندر کمرے میں داخل ہو چکی

تھیں۔ اس لیے اس نے پردہ پوشی کی ضرورت بیکار سمجھی۔
میں نے اپنے دوست سے ناصر کا تعارف کرایا۔ ناصر نے جواب میں ہم دونوں سے اپنی بیوی کو متعارف کرایا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے دوست سے جو اب سگرٹ سلگا رہا تھا۔ عزت جہاں کا مزید تعارف کرانے کی خاطر۔''
یہ ہندوستان بہت بڑی اشتراکی خاتون ہیں۔ تم نے ان کے مضامین ضرور پڑھے ہوں گے۔''
میرے دوست کو اشتراکیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس نام ہی سے ناواقف تھا۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔'' معاف فرمائیے گا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔''
عزت جہاں کی آنکھیں ان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے لباس، وضع قطع، غرضیکہ ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھی۔ جب وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرے دوست نے جرأت رندانہ سے کام لے کر دروازہ بند کردیا۔ تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔
''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔۔۔۔۔۔ ناصر ہر روز مجھ سے کہتے تھے کہ چلو چلو۔۔۔ پر میں ان دنوں کچھ زیادہ مصروف رہی۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ آپ تو اب یہیں تشریف لے آئے ہیں نا؟۔۔۔۔۔۔ مکان برا نہیں!''
اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر خوشنودی کا اظہار کیا۔
میں نے کہا۔'' جی ہاں اچھا ہے۔۔۔ ہوادار ہے۔''
''ہوادار تو خاک بھی نہیں۔۔۔''
''بیچ کا دروازہ کھلا ہو تو بہت ہوا آتی ہے۔''
''ہاں شاید پہلے آرہی تھی۔''
دیر تک میں اور ناصر اور عزت جہاں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر میں محسوس کررہا تھا کہ عزت کے دل میں کُھد بُد ہورہی ہے۔ میرا دوست جلدی حاضر ہونے کا وعدہ کرکے دو لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں کیا کررہا تھا؟۔۔۔۔۔۔ غالباً وہ یہی معلوم کرنے کے لیے بیقرار تھی۔ نصف گھنٹہ گزرنے پر اس نے بڑے تکلف کے ساتھ مجھ سے کہا۔'' ایک گلاس پانی پلوا دیجیے۔''
فلیٹ کے دو راستے ہیں ایک سامنے سے۔ ایک پیچھے۔ میں نے درواز کھلوانا مناسب خیال نہ کیا۔ چنانچہ دوسرے

راستے سے گلاس میں پانی لے کر آگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ میاں بیوی دونوں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔

عزت جہاں نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔ ''آپ نے بہت تکلیف کی۔''

''جی نہیں۔۔۔۔۔۔ اس میں تکلیف کی بات ہی کیا ہے۔''

پانی پی کر اس نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑیں اور بناوٹی لہجے میں کہا۔ ''اس فلیٹ کے غالباً دو راستے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

کچھ دیر پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ بدل کر اشتراکیت کی طرف آگیا اور میں اور عزت دونوں سرخ ہوگئے۔ میں نے باتوں باتوں میں اشراکیت کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔

''اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام انسانی ادارے مثال کے طور پر مذہب، تاریخ، سیاست وغیرہ سب ہمارے معاشی حالات سے اثر پذیر ہو کر معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ موجودہ نظامِ معیشت جس میں امیر اور غریب کا امتیاز ہے اور جس میں پیداوار کے تمام آلات ایک محدود اونچے طبقے کے ہاتھ میں ہیں انھیں صرف ذاتی فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے یہ ایک مضر اور تباہ کن ادارہ ہے جسے ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہیے۔۔۔۔۔۔ جب اس کا خاتمہ ہو جائے گا تو آپ کے خیال کے مطابق اشتراکی دور شروع ہوگا۔ جس میں تمام آلاتِ پیداوار۔۔۔۔۔۔یہی ہمارے معاشی حالات پر حاوی ہیں عوام کے قبضے میں آجائیں گے۔

عزت جہاں نے میری تائید کی۔ ''جی ہاں۔''

''عوام کی قوت اور حکومت کی نمائندہ ایک خاص جماعت حاملہ ہوگی۔ جسے اشتراکی حکومت کہا جائے گا۔''

عزت جہاں نے پھر کہا۔ ''جی ہاں۔''

''لیکن یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اشتراکی نظام میں بھی تمام قوت ایک محدود طبقے کے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ نمائندہ جماعت اشتراکیوں کے فلسفے کے مطابق تمام لوگوں کی بہبودی کو مدارِ عمل بنائے گی۔ اس جماعت کو ذاتی اغراض اور شخصی منافع سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اس کے اغراض عوام کے مقاصد کے مطابق ہوں گے۔ لیکن۔۔۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر وثوق سے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ محدود جماعت جو بظاہر عوام کی نمائندہ جماعت ہوگی۔ کچھ عرصے کے بعد سرمایہ داروں کی طرح ہر قسم کے ظلم و ستم ڈھائے گی۔۔۔ کیا یہ لوگ غاصب نہیں ہوسکتے۔۔۔۔۔۔ کچھ عرصے کی

حکومت کے بعد کیا ان کے دل میں ذاتی اغراض پیدا نہیں ہوں گی؟''

عزت جہاں مسکرائی۔ ''آپ تو باکونین کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔''

میں نے جوش کے ساتھ کہا۔ '' مانتا ہوں کہ کارل مارکس کے ساتھ ساری عمر لڑنے کے باوجود باکونین کسی نقطہ مفاہمت پر نہیں پہنچ سکا اور اپنے اخلاص کے باوجود کسی مدلل اور منظم فلسفے کی بنیاد نہیں ڈال سکا۔ لیکن اس کا یہ کہنا جھوٹ نہیں ہے کہ ڈیمو کریسی بھی ایک بڑی جماعت کے دوسری چھوٹی جماعت پر جابرانہ نظامِ حکومت کا نام ہے۔ میں ایسے دورِ سیاست کا قائل ہوں جس کا سماج ہر قسم کی حکومت اور دباؤ سے آزاد ہو''۔

عزت پھر مسکرائی۔ تو آپ انارکزم چاہتے ہیں جو ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ آپ کا باکونین اور کروپٹوکین دونوں مل کر اسے قابلِ قبول نہیں بنا سکتے۔۔۔؟''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ '' اشتراکیت کے پاس بھی کوئی قابل عمل فلسفہ نہیں تھا۔ لوگ اسے دیوانوں کا ایک دھندلا سا خواب سمجھتے تھے۔ مگر انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اس کو ایک قابل عمل معاشرتی نظام کی صورت میں پیش کیا۔۔۔ ممکن ہے انارکزم کو بھی کوئی کارل مارکس مل جائے۔''

عزت جہاں نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور جیسے اس نے میری بات سنی نہیں مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کے دوست وعدہ کر کے گئے تھے ابھی آئے نہیں؟''

میں نے بہتر سمجھا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔ '' انھوں نے تکلف برتا تھا۔ ورنہ ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ نہیں آئیں گے۔''

عزت جہاں نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ ''کیوں؟''

میں ناصر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جو اب ہماری گفتگو میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ '' دو لڑکیاں اس کے ساتھ ہیں انھیں چھوڑ کر وہ ایسی خشک محفل میں کیسے آسکتا ہے؟''

عزت نے یہ سن کر مجھ سے دریافت کیا۔ ''یہ دو لڑکیاں فلم ایکٹرس تھیں؟''

''جی نہیں۔''

''دوست ہوں گی؟''

''جی نہیں۔۔۔ آج ہی جان پہچان ہوئی ہے۔''

اس کے بعد آہستہ آہستہ میں نے ساری بات بتادی اور جنسیات کے بارے میں اپنے دوست کا نظریہ بھی اچھی طرح واضح کردیا۔ بڑے غور سے میری تمام باتیں سن کر اس نے فتویٰ دینے کے انداز میں کہا۔ ''یہ انارکزم کی بدترین قسم ہے۔ آپ کے دوست کے خیالات اگر عام ہو جائیں تو دنیا میں ایک اندھیر مچ جائے۔ عورت اور مرد کے تعلقات صرف۔۔۔ صرف بستر تک محدود ہو جائیں اور کیا؟۔۔۔یہ آپ کے دوست جو کوئی بھی ہیں یہ عورت کو کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ڈبل روٹی، کیک یا بسکٹ۔۔۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ کافی یا چائے کی ایک گرم پیالی۔ پی اور جھوٹے برتنوں میں ڈال دی۔ لعنت ہے ایسی عورتوں پر جو یہ ذلت برداشت کرلیتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی میں جنسیات کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ کیا آپ کے یہ دوست بغیر عورت کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ہر روز عورت کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟''

میں نے اپنے ذاتی خیال کا اظہار۔ ''عورت کی ضرورت ہر مرد کو عمر کے ایک خاص حصے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کو بعض زیادہ اہمیت دیتے ہیں بعض کم۔ میرا دوست ان بعض لوگوں میں سے ہے جو اس کو روزمرہ کی ایک ضرورت سمجھتے ہیں۔ اگر کھانا پینا اور سونا اہم تو اس کے نزدیک عورت بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی پر ہو مگر اس نے اپنی اس کمزوری کی کبھی پردہ پوشی نہیں کی۔''

عزت جہاں کے لہجے میں اور زیادہ تلخی پیدا ہو گئی۔ ''پردہ پوشی نہیں کی۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ راستی پر ہیں۔ فاحشائیں کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا وجود فطری ہے۔ چونکہ ہمارا نظام بالکل غلط اور غیر فطری ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ چکلے نظر آتے ہیں۔ چونکہ آپ کے دوست کا نظامِ عصبی تندرست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت اور روٹی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ روٹی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس جسمانی تعلق کے بغیر یقیناً زندہ رہ سکتا ہے!''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی میں زندگی اور موت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہر مرد کو عورت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس کو دستیاب ہو سکتی ہے۔ وہ اسے اپنی ضروریاتِ زندگی میں شامل کرلیتا ہے۔''

ناصر کو اب اس گفتگو سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی بیزاری کا اظہار کرہی دیا۔ ''ہٹاؤ یار اس قصے کو۔۔۔ بہت وقت ہوگیا اور ہمیں یہاں سے پورے انیس میل دور جانا ہے۔۔۔ چلو عزت چلیں۔''

عزت نے اپنے خاوند کی بات سنی ان سنی کردی اور مجھ سے کہا۔ ''کچھ بھی ہو مگر آپ کے دوست اصل میں بہت ہی بدتمیز ہیں۔ یعنی اتنا بھی کیا کہ یہاں ہم تین آدمی بیٹھے ہیں اور آپ [illegible]

[illegible]
قوۃ۔۔۔۔۔۔''

ناصر کو نیند آرہی تھی۔ '' ارے بھئی خدا کے لیے اب سلسلے کو ختم کرو۔۔۔ چلیں!''

عزت بھنا گئی۔ '' ارے واہ۔۔۔ ارے واہ۔۔۔ یہ تو آہستہ آہستہ میرے خاوند ہی بن بیٹھے ہیں۔''

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ ناصر بھی ہنس دیا۔ ہم دونوں ہنسے تو عزت جہاں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

'' اور کیا۔۔۔ یہ آہستہ آہستہ خاوند بننا ہی تو ہے۔ یعنی مجھ پر رعب جمایا جارہا ہے۔''

اس کے بعد ناصر اور عزت تھوڑی دیر اور بیٹھے اور چلے گئے۔ پہلی ملاقات خاصی دلچسپ رہی۔ ہندوستان کی اشتراکی تحریک کے بارے میں گو مفصل طور میں عزت جہاں سے گفتگو نہ کرسکا۔ لیکن پھر بھی اس نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے سوچا کہ اس سے آئندہ ملاقاتیں بہت ہی فکر خیز ہوں گی۔

میں نے اپنا فلیٹ لے لیا۔ دلی سے بیوی بھی آگئی تو عزت ایک بار پھر آئی۔ دونوں پہلی ہی ملاقات میں سہیلیاں بن گئی۔ چونکہ عزت جہاں کو ہر روز اپنے دفتر جانے کے لیے شہر آنا پڑتا تھا۔ اس لیے شام کو گھر لوٹتے ہوئے اکثر ہمارے ہاں آجاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور ہم ہیگل، کارل مارکس، اینجل، باکونین، کروپٹوکین اور تراتسکی کے متعلق باتیں کریں اور سوشلزم کے ہر دور کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ مگر میری بیوی اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ جاتی تھیں اور جانے کیا کیا باتیں شروع کردیتی تھیں۔ اگر کبھی میں سوشلزم پر اسٹالن کی موجودہ جنگی پالیسی کے اثر کا ذکر چھیڑتا تو وہ میری بیوی سے سفید اون کا بھاؤ پوچھنا شروع کردیتی۔ اگر میں ایم۔ این۔ رائے کی ریاکاری کی بات کرتا تو '' خاندان '' فلم کے کسی گیت کی تعریف شروع کردیتی تھی اور اگر میں اسے اپنے پاس بٹھا کر روس کے موجودہ جنگی نظام پر گفتگو کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اٹھ کے باورچی خانے میں چلی جاتی اور میری بیوی کا ہاتھ بٹانے کی خاطر پیاز چھیلنے میں مشغول ہو جاتی۔

دن بھر وہ پارٹی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ شام کو تھکی ہوئی گھر پہنچتی تھی جو دفتر سے بیس پچیس میل دور تھا۔ الیکٹرک ٹرین میں ایک ایک گھنٹے کا سفر اس کو دن میں دو دو مرتبہ کرنا پڑتا تھا۔ آتے اور جاتے ہوئے۔ اس کا خاوند مل میں ملازم تھا۔ مہینے میں پندرہ دن اسے رات کو ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ لیکن عزت خوش تھی۔ میری بیوی سے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی۔ '' شادی کا مطلب صرف بستر نہیں اور خاوند کا مطلب صرف رات کا ساتھی نہیں۔ دنیا میں انسان

صرف اسی کام کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں۔ ''۔۔۔۔۔۔ اور میری بیوی اس کی اس بات سے بہت متاثر تھی۔
عزت جہاں اپنا کام بہت خلوص سے کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی بے اعتنائیاں بری معلوم نہیں ہوتی تھیں وہ مجھ سے زیادہ میری بیوی کے پاس بیٹھنا اور اس سے بات چیت کرنا پسند کرتی تھی۔ مجھے اس کا مطلقاً خیال نہیں تھا۔ بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت جلد میری بیوی کو جو متوسط طبقے کے سرمایہ داروں کی ذہنیت رکھتی تھی۔ اپنی ہم خیال بنا لے گی۔
ایک روز کا ذکر ہے۔ میں اپنے دفتر سے جلد واپس آگیا۔ غالباً دو عمل ہوگا میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ میری بیوی کے بجائے ناصر نے کھولا میں سیدھا اپنے میز کی طرف بڑھا۔ چونکہ حسبِ عادت مجھے اپنا بیگ رکھنا تھا۔ ناصر سامنے میرے پلنگ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ادھر صوفے پر عزت جہاں لیٹی تھی۔
ناصر نے کہا۔ '' بھئی مجھے بخار ہو رہا ہے۔ ''
میں نے عزت جہاں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ '' اور آپ۔۔۔۔۔۔؟ ''
عزت نے جواب دیا۔ '' جی نہیں۔ میں ایسے ہی لیٹی ہوں۔ ''
'' رقیہ کہاں ہے؟ ''
عزت نے جواب دیا۔ '' دوسرے کمرے میں سو رہی ہیں۔ ''
'' یہ کیا۔۔۔ ہر ایک سو رہا ہے۔ '' میں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ '' رقیہ۔۔۔ رقیہ ''
اندر سے نیند بھری آواز آئی۔ '' جی! ''
'' ارے بھئی ادھر آؤ۔۔۔ کب تک سوئی رہو گی؟ ''
رقیہ آنکھیں ملتی آئی اور عزت کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناصر کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔ میں اپنی بیوی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گہری نیند کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کیونکہ رقیہ ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سونے کی عادی ہے۔ اس کے بعد عزت اور میری بیوی کے درمیان کروشیے اور سلائیوں کی باتیں چھڑ گئیں۔ اسی دوران میں چائے آگئی۔ ناصر نے لیٹے لیٹے ایک پیالی پی لی۔ میں نے بخار دور کرنے کے لیے اسے اسپرو کی دو ٹکیاں دیں جو اس نے لے لیں۔
ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ لوگ بیٹھے رہے۔ اس کے بعد چلے گئے۔
رات کو سونے کے لیے جی میں پلنگ پر لیٹا تو حسبِ عادت میں نے اوپر کے تکیے کو دہرا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نچلے تکیے کا غلاف [illegible]

کا غلاف ہی نہیں ہے۔ رقیہ سے جو میرے پاس کھڑی اپنے کپڑے بدلنے جا رہی تھی میں نے پوچھا۔ ''اس تکیے
پر غلاف کیوں نہیں چڑھایا۔''

رقیہ نے غور سے تکیے کی طرف دیکھا اور حیرت سے کہا۔ ''ہائیں، سچ مچ یہ غلاف کدھر غائب ہوگیا۔۔۔
ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کے دوست۔۔۔۔۔۔''

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا ناصر لے گیا؟''

''کیا معلوم؟'' رقیہ نے رک رک کر کہا۔ ''ہائے کتنی شرم کی بات ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے ابھی تک یہ بات آپ کو بتائی ہی نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ میں اندر سو رہی تھی اور وہ آپ کے دوست اور اس کی بیوی۔۔۔۔۔۔ لعنت بھیجیے۔ بڑے بدتمیز نکلے۔۔۔''

دوسرے روز تکیے کا غلاف پلنگ کے نیچے سے ملا جس کو چوہوں اور کاکروچوں نے جگہ جگہ سے دھن ڈالا تھا اور اسپرو کی دو ٹکیاں جو میں نے ناصر کو بخار دور کرنے کے لیے دی تھیں۔ وہ بھی پلنگ کے نیچے سے مل گئیں!

عزت کے لیے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کہی تھی۔ جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں وہ ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا، ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بنڈل لیتا اور چلا جاتا۔

چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امرتسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونی لال منگواتا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت ہی کم تھے۔ پھر بھی ہر ہفتے ولائت کی ڈاک سے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام سے کئی خوبصورت بنڈل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے اور رسالے بیچنے کیلیے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لیے منگواتا تھا۔ چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بنڈل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر الگ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں۔ شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے راما، بڑا صاف ستھرا اور سو فی صدی نوکر۔ سمجھدار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا جس کو صرف

اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو دلچسپی نہیں۔ چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے۔ موجود نہ ہو جب بھی ایک بات ہے۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ اس کو اُس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ اس سے سوڈے برف کے لیے کہا جائے یا پانوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر راما دونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا۔ جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن روپا کو دے دیے تھے اور جدی مکان بھی اور خود علیحدہ ہوگیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی اور چونی لال اپنے بمبئے اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا۔ لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے۔ اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کروالیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اسے اپنی خوابگاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی۔ لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو۔ جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو۔ جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں انھیں اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لیے بنوایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ جن سے نشہ کم ہو جاتا تھا۔ ڈر کے مارے کوئی گھر نہ جانا چاہے تو علیحدہ سجے سجائے

دو کمرے موجود تھے۔۔۔ چھوٹا سا ہال تھا۔ اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے۔ لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست ان کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا۔ ''کیا کہتے ہو یار۔۔۔ مکان تمہارا اپنا ہے۔'' عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیش نظر ایسا تکلف کبھی نہیں برتتا تھا۔

چونی لال کا باپ لالہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا جب چونی لال تھرڈ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پر ڈالیاں آ رہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تنخواہ بونس سیدھی بنک میں چلی جاتی تھی۔ لیکن ریٹائر ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی۔ لیکن لالہ گردھاری لال نے بیکار مباش کچھ کیا کر، مکانوں کا سٹہ کھیلنا شروع کر دیا اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائیداد گنوا دی، پھر لمبی بیماری نے آگھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری لال کا حال پتلا ہونے کے ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم جلیس تھا۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا۔ لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا۔ جو ایک بُت سے پجاری کا ہو سکتا ہے یا ایک آقا سے ایک غلام کا۔

ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی۔ جو اب اس کے دل و دماغ میں تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا۔ اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیے ہوئے امریکی اور انگریزی پرچے ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دنوں کی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے۔ جس سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے

افسر کا سجیلا بیٹا ہربنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہوئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہربنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی الھڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن ہربنس کا شوق پورا کرنے کے لیے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لیے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی۔ لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔۔۔

لڑکے کو شراب پینی آگئی۔ تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کردی اور کچھ اس انداز سے کہ ہربنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملے۔

جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہربنس ہی کی دوستی کافی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں پوری کرا لیتا تھا۔ ویسے تو شہر میں چونی لال کے اثر و رسوخ کا ہر شخص قائل تھا۔ لیکن جب سے ہربنس اس کے حلقہ واقفیت میں آیا تھا اس کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی تھی۔

اکثر یہی سمجھتے تھے کہ چونی لال اپنے اثر و رسوخ سے ذاتی فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لیے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے کا اور انھیں اپنا ممنونِ احسان بنانے کا بلکہ یوں کہیے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات۔۔۔ طارق کرنے کا کہ بھی کمال ہے۔۔۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔

ایک کو خوش کیجیے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقعہ ملے اور اس سے بدلہ لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہوگئیں۔ مسلمان اور ہندوؤں دونوں کے لیے اس نے کام کیا۔ لیکن صرف ان ہی کے لیے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا۔ شراب اور بیئر کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔

ہربنس کا الھڑپن اب بہت حد تک دور ہوچکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دستر خوان بچھا کر نت نئی چیزیں اس کے لیے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان میں موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول پر انگلی گھما رہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا۔۔۔بلوائی؟۔۔۔ نہیں!۔۔۔ راما؟۔۔۔ نہیں! وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آرہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہربنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز آئی۔۔۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہربنس کا رنگ ہلدی کے گابھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے چونی لال نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔'' آواز ہربنس کے سوکھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔

چونی لال نے اس کو دلاسا دیا۔ ''گھبرائیے نہیں۔۔۔۔۔۔بتائیے کیا ہوا ہے۔''

ہربنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔ لہو۔۔۔۔۔۔۔ بند ہی نہیں ہوتا لہو۔''

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید لڑکی مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر جب اس کے گھر میں اس کے مہمان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں چونی لال کا دماغ غیر معمولی طور پر مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہربنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا ''میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔''

یہ کہہ اس نے اس کمرے کا رخ کیا۔ جس میں ہربنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کرتا رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔۔۔ نہیں۔ بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوتی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے ننگ و ناموس کا محافظ ہے۔

راما؟۔۔۔۔۔۔ کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آرہا تھا۔۔۔ برف؟۔۔۔۔۔۔ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفریجریٹر موجود تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس نے سوچا کچھ بھی ہو۔ کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا ہی پڑے گا۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے اسپرنگوں والے پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی۔ لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ''بھیا!''

چونی لال نے کھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ روپا! اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سا لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہربنس کو پتا نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کیلیے دروازہ کی طرف بڑھا۔

دہلیز میں ہربنس کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ چونی لال کو دو بدو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہربنس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر لعمق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہربنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا۔ مگر ہربنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہربنس زور سے چیخا اور دوڑ کر اس میں داخل ہوا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔

چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہربنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ دونوں چونی لال اور ہربنس کچھ دیر خاموش رہے۔۔۔ لیکن ہربنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ۔۔۔۔۔۔ کہ یہ تمہاری بہن ہے۔۔۔یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے۔۔۔۔۔۔ اس مسلمان سب انسپکٹر کی۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ محمد طفیل۔۔۔ہاں ہاں محمد طفیل۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ بشیر احمد۔۔۔ نہیں نہیں محمد طفیل۔۔۔۔۔۔ وہ طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی۔۔۔ اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی اور کہا مسلمان ہے۔۔۔مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔ تم بولتے کیوں نہیں۔'' اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ''تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔۔۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔۔۔ لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔مجھے

کچھ معلوم نہیں تھا۔''

چونی لال نے ہولے سے کہا۔ ''گھبرائیے نہیں۔۔۔۔۔۔آپ کے پتا جی کی عزت کا سوال ہے۔'' لیکن ہربنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔

تیسرے روز کرفیو ہٹنے پر چونی لال کے دو نوکروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا اسٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لیے اخباروں اور رسالوں کا ایک بنڈل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔

کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔